یکم و ۱۶ مارچ ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۵۔۶

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمد ذوالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

ایران خامنہ ای کے منصوبے پر گامزن

Najmeh Bozorgmehr - Andrew England

امریکی و اسرائیلی حملوں کے جواب میں ایرانی افواج نے ایک ایسے منصوبے پر عمل شروع کر دیا ہے جسے آیت اللہ علی خامنہ ای اور ایران کی اعلیٰ عسکری قیادت نے تیار کیا تھا۔ اس منصوبے کا مقصد مشرقِ وسطیٰ میں افراتفری پھیلانا، عالمی منڈیوں میں ہلچل پیدا کرنا اور کشیدگی کو اس حد تک بڑھا دینا ہے کہ امریکا اور اسرائیل کو اپنے حملے روکنے پر مجبور کیا جا سکے۔

ایک حکومتی ذریعے نے فنانشل ٹائمز کو بتایا کہ ایرانی سپریم لیڈر، جو تہران پر حملوں کی پہلی لہر میں جاں بحق ہو گئے تھے، اور ان کے قریبی ساتھیوں نے گزشتہ جون میں اسرائیل کی جانب سے ایران کے خلاف ۱۲ روزہ جنگ کے بعد ایک 'تفصیلی' منصوبے پر کام شروع کر دیا تھا۔

اس منصوبے میں توانائی کی تنصیبات پر حملے اور ایسے اقدامات شامل تھے جو خطے میں فضائی سفر میں خلل پیدا کر سکیں۔

ذرائع نے بتایا کہ 'ہمارے پاس کشیدگی بڑھانے اور ایک بڑی آگ بھڑکانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا تاکہ سب کو صورتحال کی سنگینی کا اندازہ ہو۔ جب ہماری سرخ لکیریں تمام بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عبور کی گئیں تو ہم کھیل کے قواعد پر مزید عمل نہیں کر سکتے تھے۔'

یہ منصوبہ خامنہ ای کی شہادت اور وزیر دفاع اور پاسدارانِ انقلاب کے سربراہ سمیت کم از کم ۶ اعلیٰ ایرانی فوجی اور انٹیلی جنس حکام کے امریکی اور اسرائیلی بمباری میں جاں بحق ہونے کے باوجود نافذ کیا گیا۔

خامنہ ای کی شہادت کے چند گھنٹوں بعد قائم کی گئی تین رکنی عبوری قیادت کونسل کے رکن آیت اللہ علی رضا اعرافی نے پیر کو ایک ویڈیو پیغام میں کہا کہ 'یہ جنگ ان کے (خامنہ ای کے) منصوبے کے مطابق جاری ہے۔'

پیر کے روز جب ہفتے کے اختتام کے بعد عالمی منڈیاں دوبارہ کھلیں تو ایرانی حکومت نے اپنے ردعمل کو ڈرامائی طور پر بڑھاتے ہوئے خلیج کے تیل سے مالا مال خطے میں توانائی کی تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ ایران نے قطر میں ایک اہم گیس تنصیب اور سعودی عرب کی ایک بڑی آئل ریفائنری پر ڈرون حملے کیے۔

اس کے نتیجے میں دنیا کے بڑے مائع قدرتی گیس (ایل این جی) برآمد کنندگان میں شامل قطر کو اپنی گیس کی سپلائی روکنی پڑی۔ آبنائے ہرمز، جہاں سے دنیا کی کل توانائی اور ایل این جی کا تقریباً پانچواں حصہ گزرتا ہے، میں جہاز رانی سست پڑنے کے باعث تیل اور گیس کی قیمتیں تیزی سے بڑھ گئیں۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے جنگ شروع کرنے کے بعد سے ایرانی ڈرون متحدہ عرب امارات، کویت، عراق، عمان اور بحرین جیسے ممالک میں ہوٹلوں، ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں کو بھی نشانہ بنا چکے ہیں۔

ایران نے خطے میں موجود امریکی فوجی اڈوں پر بھی میزائل اور ڈرون حملے کیے اور شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ قبرص میں برطانوی فوجی اڈہ بھی نشانہ بنا۔

ایک ذریعے کے مطابق 'یہ کارروائیاں جاری رہیں گی اور کشیدگی مزید بڑھے گی۔ انہوں نے کیا توقع کی تھی؟ اگر اسلامی جمہوریہ کے سربراہ کو نشانہ بنایا جائے تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ نہیں ہوگا؟'

حکومت کی حکمت عملی کا ایک حصہ فوجی فیصلوں کو غیر مرکزی بنانا بھی ہے تاکہ اعلیٰ کمانڈروں کے مارے جانے کے باوجود فوجی کارروائیاں جاری رہ سکیں۔ ایرانی وزیر خارجہ عباس عراقچی نے عندیہ دیا کہ ایرانی افواج اب زیادہ خودمختار انداز میں کام کر رہی ہیں۔

انہوں نے الجزیرہ کو بتایا کہ 'ہمارے فوجی یونٹس اب درحقیقت کافی حد تک خودمختار اور جزوی طور پر الگ ہیں اور وہ پہلے سے دی گئی عمومی ہدایات کی بنیاد پر کارروائیاں کر رہے ہیں۔'

یہ حکمت عملی گزشتہ جون کی جنگ سے حاصل کیے گئے اسباق کی عکاسی کرتی ہے، جب اسرائیل نے ایران میں گہری انٹیلی جنس رسائی کے ذریعے جنگ کے ابتدائی گھنٹوں میں اعلیٰ فوجی کمانڈروں کو ہلاک کر دیا تھا۔

اس بار خامنہ ای اور اعلیٰ دفاعی حکام کی ہلاکت کے فوراً بعد ایران نے تیزی سے جوابی کارروائی شروع کی۔

ایک ذریعے نے بتایا کہ جون کی جنگ کے دوران 'تمام

اندرونی صفحات پر

- مشرقِ وسطیٰ: ایران کے بعد کس کی باری؟
- ایک مسجد کی کہانی
- اپسٹین نے مالداروں کو کیسے لُبھایا؟
- اپسٹین فائلز اور لبرل معاشرے کا طرزِ عمل
- ٹرمپ کی ڈھٹائی اور بدحواسی
- امریکی امریکا چھوڑ رہے ہیں!
- یورپ کے دفاع کا ذمّہ کس کا؟

احکامات اعلیٰ سطح سے آرہے تھے، لیکن اب زمینی سطح پر موجود فورسز پہلے سے جانتی ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے، جبکہ وہ مرکزی کمانڈ کے ساتھ مکمل رابطے میں بھی ہیں۔

شدید حملے دراصل اس احساس کا نتیجہ ہیں کہ اسلامی جمہوریہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔

جون کی جنگ میں ایران نے جوابی کارروائی محدود رکھتے ہوئے صرف اسرائیل کو نشانہ بنایا تھا اور امریکا کی جانب سے اس کے جوہری مراکز پر بمباری کے بعد قطر میں امریکی اڈے پر ایک محدود حملہ کیا تھا۔

اس بار ایران نے مبینہ طور پر متحدہ عرب امارات پر اسرائیل کے برابر یا اس سے زیادہ ڈرون اور میزائل داغے، جس کے نتیجے میں اب تک تین افراد ہلاک ہوئے۔

ایران کے پراکسی گروہ جو جون کی جنگ میں غیر فعال رہے تھے اب اس تنازع میں شامل ہو گئے ہیں۔ حزب اللہ نے شمالی اسرائیل پر میزائل داغے ہیں جس سے لبنان میں نئی جنگ کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے جبکہ عراقی ملیشیاؤں نے شمالی عراق میں امریکی اڈے کو نشانہ بنایا اور بغداد ایئر پورٹ پر امریکی مفادات پر حملے کا دعویٰ کیا ہے۔

ایران کے حامیوں نے بغداد کے گرین زون، جہاں مغربی سفارت خانے واقع ہیں، میں داخل ہونے کی کوشش بھی کی۔

یہ وسیع علاقائی تنازع وہ بدترین منظرنامہ ہے جس کا خدشہ بہت سے مبصرین کو تھا۔

یہ صورتحال ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس کے اسرائیل پر حملے کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی کا تسلسل ہے۔

اگرچہ اس حملے نے غزہ، لبنان، یمن اور ایران و اسرائیل کے درمیان کشیدگی کو جنم دیا، مگر ایران نے ابتدا میں براہ راست جنگ سے گریز کیا تاکہ لڑائی اپنی سرزمین سے دور رکھی جا سکے۔ تاہم تجزیہ کاروں کے مطابق جون میں اسرائیل اور امریکا کے حملوں کے بعد ایران کا حساب کتاب بدل گیا۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز کے ایمیل ہوکایم کے مطابق 'یکم السنوار ۷/اکتوبر کو علاقائی جنگ چاہتے تھے، مگر ان کے اتحادیوں نے اس سے گریز کیا۔ اب امریکا اور اسرائیل نے خود اس علاقائی جنگ کو اپنی شرائط پر شروع کر دیا ہے۔'

اگرچہ ایران اور اس کے اتحادیوں کے بیشتر میزائل اور ڈرون فضائی دفاعی نظام نے روک لیے مگر اس تیزی سے پھیلتے تنازع کا ایک اور پہلو اس وقت واضح ہوا جب امریکی فوج نے اعلان کیا کہ کویتی فضائی دفاع نے غلطی سے تین امریکی لڑاکا طیارے مار گرائے۔

ذرائع کے مطابق دبئی کے ہوٹلوں جیسے اہداف پر حملوں کا مقصد یہ پیغام دینا ہے کہ 'جہاں بھی امریکی موجود ہوں گے، وہاں کوئی جگہ محفوظ نہیں رہے گی۔'

انہوں نے مزید کہا کہ خلیج کے تیل سے مالا مال ممالک کو اب 'سرمایہ کاری کے بڑھتے ہوئے خطرات' کا سامنا کرنا پڑے گا۔ 'سرمایہ کار کہیں گے کہ آپ ایران کے قریب ہیں اور کسی بھی لمحے ایک میزائل آپ کے ملک پر گر سکتا ہے۔'

تاہم ایسے ممالک کو نشانہ بنا کر جو حالیہ برسوں میں ایران کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور صدر ٹرمپ کو سفارت کاری اختیار کرنے کا مشورہ دے رہے تھے، ایرانی حکومت خود کو مزید تنہائی کی طرف دھکیلنے اور پڑوسی ممالک کو امریکا اور اسرائیل کی جنگ کی حمایت پر آمادہ کرنے کا خطرہ مول لے رہی ہے۔

کچھ مبصرین کے مطابق ایران کا ردعمل انتہائی خطرناک ہے۔ لندن کے تھنک ٹینک RUSI کی سینئر محقق برجو اوزجیلیک کے مطابق یہ وہ 'خوفناک منظرنامہ' ہے جس کا خدشہ پہلے سے ظاہر کیا جا رہا تھا۔

بعض ماہرین اور حکومتی ذرائع کا کہنا ہے کہ ۸۶ سالہ خامنہ ای کو اپنی ممکنہ شہادت کا اندازہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ تہران میں ہی قیام کیا اور ایسے اقدامات کیے کہ ان کی موت کے بعد بھی نظام قائم رہے اور امریکا و اسرائیل کے خلاف ردعمل جاری رکھا جا سکے۔

اب فوجی کارروائیوں کی نگرانی پاسدارانِ انقلاب کر رہے ہیں، ان کی قیادت میجر جنرل احمد واحدی کر رہے ہیں، جنہوں نے ہفتے کے روز ہلاک ہونے والے سابق کمانڈر کی جگہ سنبھالی ہے۔

ایران کے اعلیٰ سکیورٹی عہدیدار علی لاریجانی نے سوشل میڈیا پر کہا ہے کہ 'ایران نے امریکا کے برعکس طویل جنگ کے لیے خود کو تیار کر رکھا ہے۔'

اس کے نتیجے میں تنازع مسلسل پھیلتا جا رہا ہے اور مزید ممالک اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ برطانیہ نے اتوار کو اعلان کیا کہ وہ امریکا کو ایران پر حملوں کے لیے اپنے فوجی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دے گا، جن میں گلوسٹر شائر میں RAF فیئر فورڈ اور چاغوس جزائر میں واقع مشترکہ اڈا ڈیاگو گارشیا بھی شامل ہے۔

ایمیل ہوکایم کے مطابق 'چاہے برطانیہ ہو یا خطے کے دیگر ممالک، وہ ایسی جنگ میں شامل ہو سکتے ہیں جس پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا، ایک ایسا تنازع ہے جس کی اپنی رفتار ہے اور جس کے انجام، خطرات یا مستقبل کے بارے میں کوئی مشترکہ تصور موجود نہیں۔'

"Iran executes Khamenei's plan to spread regional war". ("Financial Times". March 3, 2026)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی چند مفید مطبوعات

سیرت سید الابرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	منیر احمد خلیلی	1200/-
زندگی کے عام فقہی مسائل (حصہ اوّل تا پنجم)	رضی الاسلام ندوی	2500/-
بچوں میں خوف اسباب، علامات، تدارک کی تجاویز	فوزیہ عباس	150/-
بچوں سے گفتگو کیسے کریں؟	حفصہ صدیقی	300/-
آزاد بچے آزاد والدین	ظہور الدین خان	500/-
بچوں کے ذہنی امراض	فوزیہ عباس	400/-
منتخب الحکایات	ڈپٹی نذیر احمد	1000/-

Sayyidina Muhammad Soul Whisperer	Ahmed Imam Shafaq Hashemi Almas Taufique	500/- 500/-

اور دیگر بیسیوں کتابیں اور کتابچے قاری کے لیے مفید اور کتب خانے کی زینت!

اکیڈمی بک سینٹر

ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون: (۰۲۱)۳۶۳۶۸۰۲۰ برقی پتا: irak.pk@gmail.com

مشرقِ وسطیٰ: ایران کے بعد کس کی باری؟

افتخار گیلانی

رمضان کی دیر شب تراویح سے لوٹ کر، ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ کے علاقے مالتپے میں ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان چلانے والے میرے گُولولو اپنے ٹیلی ویژن اسکرین سے چند انچ کے فاصلے پر ایران پر ہونے والی امریکی اور اسرائیلی بمباری کا منظر دیکھ رہے تھے۔

ان کی اہلیہ یاسمین کہہ رہی تھی کہ صبح ایران پر حملوں کی خبر سن کر وہ سکتے میں آ گئے تھے۔ 'اب صرف وقت کی بات ہے، سب کی باری آئیگی۔'

باہر انقرہ معمول کے مطابق پُرسکون دکھائی دے رہا ہے۔ گاڑیاں رواں ہیں، چائے خانے آباد ہیں۔ مگر گھروں کے اندر اور اسمارٹ فون کی اسکرینوں پر ایک خاموش اضطراب پھیل رہا ہے۔

اگر تہران جل سکتا ہے تو انقرہ اور استنبول دوحہ، بغداد، بیروت اور مغربی ایشیا کے دیگر شہر کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

انقرہ یونیورسٹی میں ایک ایرانی طالبعلم حسین سارا دن اپنے والدین کو فون ملاتے رہے۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ شام ڈھلے ایک کزن نے اس خدشے کی تصدیق کر دی جس سے وہ ڈر رہے تھے۔

تہران کے علاقے نارمک میں واقع ان کا خاندانی اپارٹمنٹ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ وہ مرکزی تہران سے اٹھتے دھویں کے مرغولوں کی تصاویر اسکرول کرتے ہیں۔

جمہوری اور پاستور کے قریب کی سڑکیں، جہاں صدارتی دفتر اور رہبرِ اعلیٰ کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں کم وبیش تباہ ہو چکی ہیں۔ انقرہ کے مرکزی علاقے کزلائی میں کیفے خانوں کے اندر طلبہ بے چینی کے عالم میں گروپوں میں جمع ہیں۔

کچھ کا خیال ہے کہ ایران نے خود تصادم کو دعوت دی ہے۔ بعض کو اندیشہ ہے کہ یہ حملہ جنگ کو اور پھیلا دے گا۔ مگر ایک نکتے پر اکثر متفق ہیں؛ مشرق وسطیٰ ایک نئے اور خطرناک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

پروفیسر ولی نصر ایک ترک ٹی وی کو بتا رہے تھے کہ یہ محض عسکری کارروائی نہیں بلکہ ایک جغرافیائی سیاسی زلزلہ ہے جو دہائیوں تک خطے کی ساخت بدل سکتا ہے۔

ان کے مطابق، اسرائیل کی تزویراتی افق میں تبدیلی آ رہی ہے۔ اسرائیل اور مغربی بلاک کو معلوم ہے کہ ایران اور وہ شیعہ خطہ جو طویل عرصے تک چیلنج رہا، اب زوال پذیر خطرہ ہے۔

اب اگلا ٹارگیٹ وسیع تر سنی بلاک ہے، جس میں ترکیہ، سعودی عرب، مصر اور قطر شامل ہیں۔ یہ تجزیہ اب صرف علمی بحث تک محدود نہیں رہا ہے۔

اسرائیلی سیاسی قیادت نے براہ راست ترکیہ اور سنی اتحاد کا نام لینا شروع کر دیا ہے۔

اسرائیل کے سابق وزیر اعظم نفتالی بینیٹ، جن کی قومی سیاست میں واپسی متوقع سمجھی جا رہی ہے، نے اعلانیہ طور پر ترکیہ کو بڑھتا ہوا تزویراتی خطرہ قرار دیا ہے۔

یروشلم میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے صدر رجب طیب اردوان کو 'ایک ماہر اور خطرناک حریف' کہا، جو ان کے بقول اسرائیل کو 'گھیرنے' کی کوشش کر رہے ہیں۔

انہوں نے خبردار کیا کہ اسرائیل دوبارہ 'آنکھیں بند' نہیں کر سکتا اور اسے تہران سے لاحق خطرات کے ساتھ ساتھ انقرہ سے آنے والی 'مخاصمت' کے خلاف بیک وقت اقدام کرنا ہوگا۔

بینیٹ نے اس سے آگے بڑھ کر ترکیہ اور قطر کے درمیان ایک ابھرتے ہوئے علاقائی محور کا خاکہ کھینچا اور مسلم دنیا میں وسیع تر صف بندیوں کا حوالہ دیا۔

اس طرح کی زبان اور اس کا وقت ترکیہ میں بے چینی پیدا کر رہا ہے۔ اگرچہ فوری میدانِ جنگ ایران ہے، مگر ترکیہ میں ان بیانات کو تزویراتی اشارہ سمجھا جا رہا ہے۔

وزیر اعظم نیتن یاہو نے بھی اسی لہجے کو تقویت دی ہے۔ حالیہ بیانات میں انہوں نے یونان اور یونانی قبرصی انتظامیہ سمیت نئے اتحادوں کی تعمیر کی بات کی، جسے بہت سے تجزیہ کار ترکیہ کے علاقائی کردار کو چیلنج کرنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں۔

غزہ، لبنان، شام اور اب ایران میں پھیلتی عسکری کارروائیوں کے پس منظر میں نئی تزویراتی رقابتوں کی گفتگو محض مفروضہ نہیں بلکہ تسلسل کا تاثر دیتی ہے۔

انقرہ کی سڑکوں پر ٹیکسی ڈرائیور اپنے فون پر یہی کلپس دوبارہ چلاتے ہیں۔ دکاندار بحث کرتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ ترکیہ جیسے نیٹو کے ایک رکن ملک کو ممکنہ حریف کے طور پر پیش کیے جانے کا تصور تشویش میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اگر آج تہران نشانہ بن سکتا ہے اور کل انقرہ کو تزویراتی خدشہ کہا جا رہا ہے۔

اسرائیل میں امریکہ کے سفیر مائیک ہکابی کے بیانات نے بھی اس اضطراب میں اضافہ کیا ہے۔ جب انہوں نے اشارہ دیا کہ اسرائیل کو بائبلی سرزمین اسرائیل پر مکمل حق حاصل ہو سکتا ہے تو مشرقِ وسطیٰ میں اسے مذہبی وعظ نہیں بلکہ پالیسی سے جڑی زبان سمجھا گیا۔ نجی مبلغ کی زبان خطبہ رہتی ہے، مگر سفیر کی زبان اشارہ بن جاتی ہے۔

عام لوگ محسوس کرتے ہیں کہ جغرافیہ اب حفاظت کی ضمانت نہیں۔ درست نشانے والے میزائل اور ڈرون فاصلے سکیڑ دیتے ہیں۔ نقشہ ممکنہ اہداف کے جال میں بدل چکا ہے۔

استنبول کے علاقے فاتح میں وہ شامی پناہ گزین جو ایک جنگ سے بچ کر آئے تھے، اب دوسری جنگ کو شروع ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ شام کے تنازع سے بے گھر لاکھوں افراد کی میزبانی کرنے والا ترکیہ ایرانی عدم استحکام کے اثرات سے خائف ہے۔ ہجرت کی نئی لہر عوامی صبر اور ریاستی استعداد دونوں کو آزمائے گی۔

پروفیسر ولی نصر نے خبردار کیا ہے کہ ایران کی کمزوری یا انہدام، کرد سیاست کو بھی ازسرِنو ترتیب دے سکتا ہے۔ ترکیہ پہلے ہی عراق اور شام سے جڑے پیچیدہ کرد معاملات سنبھال رہا ہے۔ ایران میں کردوں کی حیثیت میں کوئی بڑی تبدیلی اس مسئلے کو مزید علاقائی رنگ دے سکتی ہے اور نازک توازن میں ایک تیسرا محاذ کھول سکتی ہے۔

تہران میں اسرائیلی اور امریکی رہنماؤں نے ان حملوں کو ایرانی عوام کے لیے اپنے حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا موقع قرار دیا ہے۔ مگر ریاستی انہدام کا سایہ بہت سے شہریوں کو خوف زدہ کرتا ہے۔ عراق ۲۰۰۳ء اور لیبیا ۲۰۱۱ء کی مثالیں تنبیہ کے طور پر سامنے ہیں۔ کسی حکومت کا خاتمہ استحکام کی ضمانت نہیں دیتا؛ یہ بکھراؤ اور طویل تشدد کو جنم دے سکتا ہے۔

امریکی اور ایرانی مذاکرات کار حال ہی میں جنیوا میں سنجیدہ اور تعمیری بات چیت کر چکے تھے۔ ثالثوں نے غیر معمولی کھلے پن کا ذکر کیا۔

اطلاعات کے مطابق، افزودہ یورینیم کو کم درجے پر لانے اور سخت نگرانی کے طریقہ کار پر تجاویز زیر غور تھیں۔ ایک

خاکہ دسترس میں محسوس ہو رہا تھا، کہ پھر حملے ہو گئے۔

دیکھنے والوں کے لیے سادہ پیغام ہے۔ اگر سفارت کاری واضح پیش رفت کے لمحے میں بھی ٹوٹ سکتی ہے تو مذاکرات پر اعتماد کیسے باقی رہے؟

امن کا پل زیرِ تعمیر تھا، بیچ دھار میں ٹوٹ گیا۔ ڈونالڈ ٹرمپ نے اپنی سیاسی شناخت 'ہمیشہ کی جنگوں' کی مخالفت پر استوار کی تھی۔ مگر اس بار ماضی کی امریکی مداخلتوں کو ہی اپنایا۔

انقرہ کے مالیتے میں میرے گُولولو آخر کار ٹی وی کی آواز کو کم کر دیتے ہیں۔ اسکرین پر تجزیہ کار اگلے اقدامات پر بحث کر رہے ہیں۔ ریٹائرڈ جرنیل نقشوں پر تیر کھینچ رہے ہیں۔

یاسمین چائے تیار کرتی ہیں۔ وہ دھیرے سے اپنی سلامتی پر گفتگو کرتے ہیں، اس اندیشے کے ساتھ کہ کہیں ان کا شہر بھی فہرست میں شامل نہ ہو جائے۔ اب ہر شہر محاذ کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ اور گھریلو زندگی کے درمیان پرانی لکیر مدھم پڑ رہی ہے۔ میزائل فاصلے نہیں دیکھتے، ڈرون سرحدیں نہیں مانتے۔

انقرہ سے عمان، دوحہ سے بیروت تک سڑکوں پر یقین کے بجائے عدم تحفظ غالب ہے۔ سوال اب سرگوشیوں میں نہیں پوچھا جا رہا کہ کیا خطہ بدلے گا۔ وہ بدل چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ لرزشیں کہاں تک جائیں گی، اور کیا کوئی دارالحکومت اب بھی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اگلے حملے کی قوس سے باہر کھڑا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی لاثانی تصنیف 'غبارِ خاطر' میں پانچواں صلیبی حملہ، جو سینٹ لوئس شاہِ فرانس کے دور میں ہوا، میں شامل ایک فرانسیسی افسر ژوائین ویل کی یادداشت نقل کی ہے۔

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرقِ وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا، مشرقِ وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی۔ دونوں کی مقابل حالت سے ان کی تضاد نوعیتیں آشکارا ہو گئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علمبردار تھا، مسلمان علم و دانش کے علمبردار تھے۔

یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سرو سامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادی دونوں کا۔

پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا اور دوسرے نے نتائجِ عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے، لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔

ژوائین ویل لکھتا ہے کہ جب مصری فوجوں نے منجنیقوں کے ذریعے آگ کے بان پھینکنے شروع کیے تو فرانسیسی جن کے پاس پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا بالکل بے بس ہو گئے۔ ژوائین ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے؛

ایک رات جب ہم ان برجیوں پر تھے جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جسے منجنیق کہتے ہیں، لا کھڑا کیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔

یہ حال دیکھ کر لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا ہمیں یوں مخاطب کیا۔ اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے کیونکہ اگر ہم نے ان برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگا دی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے، لیکن اگر ہم برجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے۔

ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے، میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جوں ہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔

چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا، ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے جیسے شراب کے پیپے، اور آگ کا شعلہ جو ان سے نکلتا تھا، اس کی دم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔

جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اس کی روشنی نہایت تیز تھی، چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اجالے میں آ جاتے تھے جیسے دن نکل آیا ہو۔

اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے؛

ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت بادشاہ سنتا تھا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا: 'مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے بادشاہ کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا'۔

لیکن فائدے کا یہ یقین خود اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا، کیونکہ بالآخر کوئی دعا بھی سود مند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

مولانا آزاد کے مطابق یہ حال تو تیرہویں صدی مسیحی کا تھا، لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ اور مشرق کا مقابلہ ہوا تو اب صورتحال یکسر الٹ چکی تھی۔ اب بھی دونوں جماعتوں کے متضاد خصائص اسی طرح نمایاں تھے جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہے تھے، لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی وہ اب مسلمانوں کی ہو گئی تھی اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی اسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔

اسی طرح اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجام مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں جو بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں 'ختم خواجگان' پڑھا جائے۔

ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں ادھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے 'یا مقلب القلوب یا محول الاحوال' کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختم خواجگان!

نہ جانے وہ لوگ کہاں گئے، جو خدا کی مدد کے علاوہ خدا کے پیدا کیے ہوئے سرو سامان پر اور روحانی مادی قوتوں اور سائنسی بنیادوں پر یقین رکھ کر فتح و شکست کا فیصلہ کرتے تھے۔

مشرق وسطیٰ میں اب ایک ایک کر کے سب کا نمبر آ رہا ہے۔ شیعہ محور کے زوال کے بعد اب سنی ممالک کا نمبر آ رہا ہے۔ اگر اب بھی اتحاد و اتفاق کے علاوہ سائنسی بنیادوں پر اپنے دفاع کا انتظام نہ کیا تو متحدہ امارات سے لیکر مصر تک کے شہر اگلے تہران اور غزہ ہوں گے۔ پھر نہ کہنا کہ خبر نہ ہوئی۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۴ مارچ ۲۰۲۶ء)

ایک مسجد کی کہانی

Ayse Sena Aykin

مسلمانوں نے اسپین پر کم وبیش آٹھ صدیوں تک حکومت کی۔ اِس دوران زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔ ہسپانیہ میں آباد ہونے والے مسلمانوں اور اُن کی اولاد نے اِس خطے کو غیر معمولی ترقی اور خوش حالی سے ہم کنار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے ملک کے طول وعرض میں اپنی حاکمیت کا سکہ بٹھانے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ فطری علوم وفنون میں بھی ایسا کچھ کیا جاتا رہے جس سے مسلمانوں کی موجودگی اُن کے نہ ہونے کی صورت میں بھی برقرار رہے۔

مسلمانوں کو ۱۴۹۲ میں مسیحی افواج کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شکست فیصلہ کن نوعیت کی تھی۔ ہسپانیہ سے مسلمانوں کو مکمل طور پر نکالنے اور غیر موثر کرنے میں مسیحیوں کو ایک صدی کا وقت لگا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسلمان ہر شعبے میں چھائے ہوئے تھے۔ صنعت وحرفت میں بھی اور درس وتدریس میں بھی۔ ہسپانوی معیشت میں مسلمانوں کا کردار اِس قدر بنیادی اور کلیدی تھا کہ اگر تمام ہی مسلمانوں کو فوری طور پر ہسپانوی سرزمین سے بے دخل کر دیا جاتا تو شدید معاشی اور معاشرتی انتشار پھیل جاتا۔ مسلمانوں نے ہسپانیہ میں (جسے اندلس کہا جاتا تھا) فنِ تعمیر کے حوالے سے بھی بہت کام کیا۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی مساجد، قلعے، محل اور دیگر عمارتیں آج بھی موجود ہیں اور عہدِ گزشتہ کے شکوہ کی داستان نہایت پُروقار انداز سے سناتی ہیں۔

جنوبی اسپین میں المونا سٹرلا ریئل مسجد ایک ہزار سال پرانی ہے۔ یہ مسجد یورپ کے دیہی علاقوں کی مساجد میں بہت نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ مسجد اِس خطے کے لوگوں کو مسلم ماضی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

مسلمانوں نے اندلس یا اندلسیا کہلانے والے علاقے (موجودہ اسپین) پر ۷۱۱ سے ۱۴۹۲ عیسوی تک حکومت کی تھی۔ مسلم اقتدار کے عہدِ زریں میں تعمیر کی جانے والی المونا سٹرلا ریئل مسجد کم وبیش مکمل اصل حالت میں برقرار ہے۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ یہ مسجد عبدالرحمٰن سوم کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ وہ اندلس کے غیر معمولی اور انتہائی بااثر حکمرانوں میں سے تھا۔ آج اِس مسجد کو اسپین میں دیہی علاقوں کی ایسی واحد مسجد تصور کیا جاتا ہے جس نے ہزار سال کی مدت کے دوران کئی ادوار دیکھے ہیں اور اُنہیں جھیلا بھی ہے۔ اِس کا اصل ڈیزائن کم وبیش پورا کا پورا برقرار ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں علاقے پر مسیحیوں کے قبضے سے قبل اِس مسجد نے چار صدیوں تک مسلمانوں کے لیے ایک بڑے مذہبی و معاشرتی مرکز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس عمارت کو کبھی کبھی نقصان بھی پہنچا اور پھر اِسے چرچ میں بھی تبدیل کیا گیا۔ پھر بھی یہ مسجد اپنی اصل حیثیت بحال کرنے اور برقرار رکھنے میں بہت حد تک کامیاب رہی۔ آج یہ مسجد ایک بڑی ثقافتی علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس علاقے میں اِسے تاریخی ورثے کا ایک اہم جُز قرار دیا جاتا ہے۔

المونا سٹرلا ریئل نامی قصبے کے بالائی حصے میں واقع یہ مسجد ایک بڑے قدرتی پارک کا دل کش نظارہ پیش کرتی ہے۔ یہ قصبہ ہیوئیلا صوبے کا حصہ ہے۔ قصبے کی آبادی ایک ہزار تک ہے۔ مسجد کی سیر کے لیے آنے والوں کو یہ مسجد دل کش قدرتی نظارے پیش کرتی ہے۔ مسجد کی عمارت اِتنی دل کش ہے کہ اِس میں اسپین اور اُس کے باہر سے آنے والے مسلمانوں کے علاوہ تاریخ دان بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

کم وبیش ۳۸ سال قبل اسلام کو ''دریافت'' کرنے والے رافیل ہرنانڈز مانچا ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہیں۔ وہ اِس مسجد میں کچھ وقت گزارنے کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں۔ یہاں باجماعت نماز نہیں ہوتی تاہم لوگ انفرادی طور پر نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ ترکیہ کی انادولو ایجنسی سے گفتگو میں رافیل مانچا کہتے ہیں کہ اس مسجد کی عمارت میں عجیب کشش ہے۔ یہاں آنے والے اور کچھ وقت گزارنے والے ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے وہ وقت کے دریا میں کشتی رانی کر رہے ہیں۔ بہت سوں کا کہنا ہے کہ یہاں آکر اُنہیں لگتا ہے کہ وقت ٹھہر سا گیا ہے یا پھر اُس کی نوعیت بدل گئی ہے۔

مسجد کے مرکزی دروازے کے نزدیک ہی ستون پر عربی میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے۔ یہ الفاظ صدیوں سال سے ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں یعنی برقرار رہے ہیں۔ آئبیریا میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد کیتھولک بادشاہوں نے اِس مسجد کو چرچ میں تبدیل کیا۔ چند ایک تعمیراتی تبدیلیاں بھی کی گئی تاہم بعد میں یہ تبدیلیاں ختم کر دی گئیں اور مسجد اپنی اصل حالت میں بحال ہوگئی۔ اِس مسجد کی تعمیر میں رومن سلطنت کے زمانے کا بہت سا تعمیراتی سامان استعمال کیا گیا۔ علاوہ ازیں بنوامیہ کی خصوصیت سمجھی جانے والی عرب طرزِ تعمیر بھی یہاں بروئے کار لایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُس عہد کے تعمیر کردہ بعض حصے بعد میں تبدیلی کے مراحل سے گزرے۔

عربوں کے دیرپا ثقافتی اثرات

رافیل ہرنانڈز کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے طویل اقتدار نے ہسپانیہ پر غیر معمولی نوعیت کے ثقافتی اثرات مرتب کیے۔ آج بھی ہسپانوی زبان کی لغت میں کم وبیش ۱۰ فیصد الفاظ کی اصل عربی ہے۔

سیوِل، کارڈوبا، گرینیڈا اور دوسرے بہت سے شہروں کے نام دراصل عربی تھے مگر بعد میں بگڑتے بگڑتے موجودہ منزل تک پہنچے۔ مثلاً کارڈوبا دراصل قرطبہ تھا۔ گرینیڈا دراصل غرناطہ تھا۔ آج بھی ہسپانوی باشندوں کے خاندانی نام عربی زبان اور عربوں کی ثقافت کے اثرات لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً ہسپانیہ سے تعلق رکھنے والے ٹینس کے نمبر ون کھلاڑی کارلوز الکارز کے نام میں دوسرے لفظ کا عربی میں مطلب ہے چیری۔

ہرنانڈز کا کہنا ہے کہ ہسپانوی باشندے عمومی سطح پر اپنے ملک کے مسلم ماضی کے حوالے سے دوستانہ جذبات رکھتے ہیں۔ عربی اصل والے نام آج کل اسپین میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر بھی یہ نام رکھ رہے ہیں، خصوصاً نوجوان۔

قصبے کا ثقافتی مرکز

المونا سٹرلا ریئل کے باشندوں کے لیے یہ مسجد مل بیٹھنے کی معقول جگہ ہے۔ اِسے قصبے کے ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ ٹاؤن کونسل ممبر ماریا ہوزے مارٹن انارٹے کا کہنا ہے کہ یہ مسجد ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ یہ ہمارے لیے اُتنی ہی اہم ہے جتنا ہمارا اپنا گھر۔ ماریا ہوزے سیاحت اور ثقافت سے متعلق امور کی نگراں ہیں۔ ہر سال کم وبیش ایک لاکھ افراد اِس مسجد کو دیکھنے آتے ہیں۔ مسلم سیاح یہاں نماز بھی پڑھتے ہیں۔ نماز پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ نماز باجماعت بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ یہ مسجد ہمیشہ کھلی رہتی ہے اور اِسے قصبے کے کسی بھی باشندے نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ماریا کہنا ہے کہ قصبے کے لوگ اِسے ماضی کا ایک حسین تحفہ قرار دیتے ہیں اور وہ اِسے سلامت رکھنے کو اپنی اہم ذمہ داری گردانتے ہیں۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۶ \\\\\\

ایپسٹین نے مالداروں کو کیسے لُبھایا؟

Emma Brockes

کسی بھی انتہائی مالدار انسان کی زندگی میں عدمِ تحفظ کا احساس شدید اور گہرا ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اِس غم میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ چھن نہ جائے۔ بس یہی خوف اُسے زیادہ سے زیادہ اور عجیب و غریب تعلقات کی پگنڈنڈیوں پر رواں رہنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ اِس کی ایک واضح مثال ایپسٹین ہے۔

جیفرے ایپسٹین نے ایک ایسا جزیرہ بسایا جس میں دنیا بھر کی قبیح سرگرمیاں جاری رہیں۔ انتہائی مالدار طبقے کے لوگ اِس جزیرے کی سیر کرنے والوں میں شامل تھے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیا تھا جس نے مالداروں کو اِس طرف متوجہ کیا۔ ایپسٹین نے ایک خاص معاملے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ انتہائی متمول افراد کی ایک بڑی نفسیاتی کمزوری کو اچھی طرح جانتا تھا اور اُسی کے ذریعے انہیں قابو میں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جو چند افراد پورے معاشرے کی دولت پر فیصلہ کن حیثیت میں قابض ہیں اُن میں یہ احساس بہت شدت سے پایا جاتا ہے کہ غیر معمولی پیمانے پر دولت کے حصول کے نتیجے میں بھی اُن میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر پائی جانے والی ذاتی دولت انہیں عجیب و غریب اور انتہائی قبیح حرکتوں کے ارتکاب پر اُکساتی ہے۔

یہ بات بہت سوں کو بہت عجیب لگتی ہے کہ ایپسٹین جیسا کالج ڈراپ آؤٹ کس طور دنیا کے طاقتور ترین مالدار افراد کو اپنے دام میں پھنسانے میں کامیاب ہوسکا۔ اُس کی حقیقی صلاحیت کی نوعیت کیا تھی؟ کیا وہ بلیک میل کیا کرتا تھا؟ کیا وہ سماجی حیثیت سے متعلق کج فکری کو اپنے اہم ہتھیار کے طور پر بروئے کار لاتا تھا؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ جس جزیرے پر ایپسٹین نے اپنی الگ دنیا بسائی تھی وہاں شدید غیر اخلاقی سرگرمیاں عام تھیں۔ اُس نے بہت سے لڑکیوں اور عورتوں کو کسی نہ کسی طور لُبھا اور رِجھا کر اپنی دنیا کا حصہ بنایا۔ ہوسکتا ہے کہ دنیا کو یہ بات درست محسوس ہوتی ہو کہ ایپسٹین نے حیا باختہ عورتوں کے ذریعے طاقتور شخصیات کو اپنے بس میں یا اپنی دنیا میں رہنے کا عادی کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ایپسٹین نے بہت سی عورتوں سے جنسی مراسم قائم کیے اور طاقتور شخصیات کو اِس حوالے سے بہت آگے جانے کی گنجائش فراہم کی مگر وہ سب سے زیادہ توجہ اِس بات پر دیتا تھا کہ انتہائی طاقتور شخصیات کا ایک بڑا نیٹ ورک تیار کرے۔ وہ اِس نیٹ ورک کے ذریعے مزید بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا قائم کردہ نیٹ ورک عالمی معاملات پر فیصلہ کن حیثیت میں اثر انداز ہو۔

نیو یارک ٹائمز نے ایپسٹین کے مالیاتی معاملات کے سمندر میں گہری ڈبکیاں لگا کر بہت کچھ سطح پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ بھی نیو یارک ٹائمز نے دریافت کیا ہے اُس کا عمیق جائزہ لینے پر بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ سب کچھ محض جنسی بے راہ روی اور کم عمر بچیوں سے جنسی تلذذ کے لیے تھا۔ معاملات کچھ اور ہی تھے۔ یہ شدید نوعیت کی جنسی بے راہ روی تو اُن بڑے معاملات کا محض ایک حصہ تھے۔

جن طاقتور افراد کو ایپسٹین نے اپنے جال میں پھانسا، نیٹ ورک کا حصہ بنایا اُن میں اینڈریو ماؤنٹ بیٹن وِنڈسر بھی شامل تھا جسے گرفتار کیا جاچکا ہے۔ اینڈریو برطانوی تختِ شاہی کی دوڑ میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ وہ کل تک اپنے بارے میں بتانے کے حوالے سے بہت زیادہ جھجکتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ ایپسٹین کا طریقِ واردات ایسا تھا کہ وہ ایسی اہم شخصیات کو زیادہ اہمیت دیتا تھا جو کسی کے زیرِ سایہ ہونے کے باعث خود ابھر نہیں پاتی تھیں۔ اِن میں خطاب والے تو تھے مگر وہ خطاب اُن کے کام نہیں آرہے تھے۔ اینڈریو کو اپنے بھائی کے زیرِ سایہ رہنا پڑا تھا۔ ایپسٹین نے بہت چالاکی سے اُسے یقین دلایا کہ اگر وہ اُس کے گروہ میں شامل ہوجائے تو اپنی الگ اور منفرد حیثیت کو عمدگی سے منوانے میں کامیاب رہے گا۔

ایپسٹین نے انتہائی مالدار اور بااثر شخصیات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کیں اور انہیں وہ سب کچھ فراہم کرنے کی کوشش کی جس کے لیے وہ ترسے ہوئے تھے۔ معاملہ غیر اخلاقی سرگرمیوں سے بہت آگے کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اختیار کے ترسے ہوئے لوگوں کو بتائے اور سمجھائے کہ اختیار کیا ہوتا ہے اور اِس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے ایسے ترسے ہوئے لوگوں کو سبز باغ دکھائے، انہیں یقین دلایا کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ اُس کے جزیرے پر کرسکیں گے، کوئی ٹوکنے اور روکنے والا نہ ہوگا۔

ایپسٹین کے جزیرے کی سیر کرنے والوں میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو دنیا کی نظر میں بہت سنجیدہ، صاف ستھرے اور باعزت تھے۔ لوگ اُن کے بارے میں کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

ایپسٹین انتہا طاقتور شخصیات کی کمزوریوں سے واقف تھا اور اُن سے بخوبی استفادہ کرنا بھی جانتا تھا۔ جب اُسے کسی مصیبت کا سامنا ہوتا تھا تو انہی طاقتور ترین افراد ہی سے تحفظ بھی حاصل کرتا تھا۔ وہ اِس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ جن طاقتور ترین لوگوں کا اُس نے نیٹ ورک بنایا ہے وہ اپنے آپ کو اُس سے زیادہ کا مستحق سمجھتے تھے جو کچھ اُن کے پاس تھا۔ بس اِسی نکتے یا خواہش کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔

ایپسٹین کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنی چکنی چُپڑی باتوں سے اُن سب کو اپنے جال میں پھانس سکتا تھا جو اپنی غیر معمولی حیثیت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے اور مزید بہت کچھ پانے اور کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ ہر دور میں انتہائی طاقتور اور مالدار ترین افراد کے ایسے گروہ رہے ہیں جو دنیا کو چلانے کے خبط میں مبتلا رہے ہیں۔ ایپسٹین بھی ایک ایسا ہی گروہ یا کلب قائم کرنا چاہتا تھا اور اِس میں کسی حد تک تو کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ ایپسٹین کے حوالے سے حقائق کے سامنے آنے میں اِتنا زیادہ وقت اِس لیے لگا کہ جن پردہ نشینوں کے نام اِس میں تھے وہ معاملات کو دبا ہی رہنے دینا چاہتے تھے۔

آج دنیا ایپسٹین کے حوالے سے جو کچھ بھی جانتی ہے اُس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کی بسائی ہوئی نام نہاد ''بہشت'' کا بنیادی مقصد محض اِتنا نہیں تھا کہ طاقتور ترین شخصیات وہاں غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مبتلا ہوں بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک دوسرے سے ربط بھی بڑھائیں اور مل کر ایک ایسا نیٹ ورک تشکیل دیں جس کے ذریعے وسیع تر پیمانے کے اقدامات کی راہ ہموار ہو، جنگ اور امن کے فیصلے ہوں، ریاستوں کو کمزور کرنے، ہتھیانے، شکست و ریخت سے دوچار کرنے کے اقدامات کی راہ ہموار کی جائے۔ جن کے ہاتھوں میں لاکھوں، کروڑوں لوگوں کی قسمت کے فیصلے دکھائی دیتے ہیں اُن کی سوچ کو سمجھنا آسان نہیں۔ اُن کی خواہشات الگ ہوتی ہیں اور اُن خواہشات کی تکمیل کے تقاضے بھی بہت مختلف ہوتے ہیں۔

(مترجم: ابوصباحت)

"How did Epstein ensnare so many rich men? By knowing they were entitled and insecure". ("The Guardian". February 25, 2026)

ایپسٹین فائلز اور لبرل معاشرے کا طرزِ عمل

مولانا عبدالرحمٰن مصباحی

ہمارا زمانہ چونکہ آثارِ قیامت کے ظہور میں تیزی کا زمانہ ہے لہٰذا ہر چند دنوں میں کوئی ایسا ناقابل یقین حادثہ رونما ہونا جو مجموعی طور پر تمام بنونوع آدم کو حیرت میں ڈال دے؛ کوئی بعید از قیاس بات نہیں، ایسے واقعات اپنے گھناؤنے پن کی وجہ سے حیرت انگیز ضرور ہوتے ہیں مگر اس پر ظاہر کیا جانے والا سطحی ردعمل اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہوتا ہے، ایپسٹن فائلز کا قضیہ اسی طرح کی تازہ مگر بوسیدہ واردات میں سے ایک ہے، لوگ دنگ ہیں اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں بوکھلائے ہوئے ہیں کہ انسان ایسا اور اتنا گھناؤنا کیسے ہوسکتا ہے؟ اتنے بڑے کہے جانے والے لوگ اور ایسے کالے کرتوت؟ مگر اہل نظر جو ''جدید دنیا'' کے بنیادی نظریات اور عملی ڈھانچے کو خوب کرید کرد یکھ چکے ہیں اور مغربیت کو بہت گہرائی سے جانتے ہیں وہ بس لمبی سانس لے کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ہونا ہی تھا بلکہ زیرلب یہ بھی بول دیتے ہیں کہ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟

ایپسٹین فائل کا عنوان چونکہ بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے، اتنا کہ درجن بھر جہات سے اس سلسلے میں بات ہوسکتی ہے لہٰذا ہمیں اپنے اسلوب سے ہٹ کر اسے چند الگ الگ ذیلی عناوین کے تحت زیر بحث لانا ہوگا تاکہ فہم میں قدرے سہولت پیدا ہوجائے، ہم مان کر چل رہے ہیں کہ فائلز یا اس میں درج ناموں اور کرتوتوں کی قدرے تفصیل سے قارئین واقف ہیں، ویسے بھی ہمیں اس کی تفصیلات سے زیادہ غرض نہیں اس لیے کہ حادثے کی بنیاد میں پیوست نظریاتی مواد کو زیر بحث لانا ہماری نظر میں زیادہ اہم ہے، ہم نے چار سوالات کی شکل میں موضوع کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جو آگے چل کر جوابات میں زیادہ واضح اور قابل فہم ہوتا جائے گا، مفصلہ ذیل کے مطابق عنوان کی تقسیم چار حصوں میں ہوگی_

* ایک: ایسی فائلز کو منظر عام پر لایا جانا اپنے آپ میں ایک سوال طلب امر ہے، اس کے نشر کا جواز نظریۂ شفافیت کے تحت بیان کیا جاتا ہے مگر نظریۂ شفافیت خود کسی ٹیڑھی کھیر سے کم نہیں لہٰذا نظریہ شفافیت کو باریکی سے سمجھنا پہلا مرحلہ ہے، ویسے تو ان فائلز کو نشر کرنے کے خاص وقت پر بھی سوالات ہو سکتے ہیں مگر ہم اسے قاری کی قیاس آرائی پر چھوڑتے ہیں۔

* دو: لبرل اندازِ فکر کو جاننا یعنی ایک لبرل ذہن کا بندہ اپنے تئیں ایسے واقعات کو کس طور پر دیکھتا ہے؟ کیا اس کے لیے ایسے واقعات اتنے ہی تشویشناک ہیں جتنے کہ ایک عام انسان کے لیے یا ایک مذہبی ذہن کے لیے ہوتے ہیں؟ اس ضمن میں ٹھیٹھ لبرل ذہن کے لوگ بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جو کسی حد تک عملاً مذہبی رسومات ادا کرتے رہتے ہیں مگر ذہن شعوری یا غیر شعوری طور پر لبرل والا رکھتے ہیں۔

* تین: کیا یہ محض مغرب کے بڑے بڑوں کا اخلاقی زوال ہے یا پھر بات اس سے آگے کی ہے جسے بہت گہرائی کے ساتھ دھیان سے سمجھنے کی ضرورت ہے؟ یعنی ایک گرے ہوئے کردار کا آدمی کہیں کا بھی ہوسکتا ہے مشرق یا مغرب اور کیسا بھی ہوسکتا ہے امیر یا غریب، کیا بات اتنی سادہ سی ہے؟

* چار: سیکولر جمہوریت یا جدید ریاست کے ڈھانچے میں ایسے مجرمانہ کردار کے لوگوں کے لیے کس حد تک پذیرائی ہے؟ کیا جدید ریاست میں یہ سب کچھ ناقابل قبول حرکت ہے یا پھر ایک اتفاقاً پیش آنی والی صورت حال جس کا تب تک دفاع کیا جائے گا جب تک براہ راست کوئی قانون اس ہرلاگو نہیں ہوتا یا لوگ انقلابی نعروں کے ساتھ تختہ پلٹ کے لیے نکل نہیں پڑتے؟

اِن سوالات کے جوابات جوں جوں کھلتے جائیں گے ویسے ویسے ایپسٹن فائلز کے حقائق بھی کھلتے جائیں گے، چونکہ موضوع کافی گھناؤنے واقعہ سے متعلق ہے اور تھوڑا سا ٹیڑھا ہے سو ہم چاہیں گے کہ تحقیق کی گنگا الٹی ہی بہے، جواب دینے میں ہم چوتھے سوال سے شروع کر کے پہلے تک جائیں گے اور پھر ایک خاتمہ شامل کر کے ختم کردیں گے، چار مرحلوں میں بہت سے جملے ہوں گے جہاں رک کر مزید غور کرنے کے اپنے فائدے ہوں گے، اُس علم دوست شخص کے لیے جو حقائق تک پہنچنے کا وافر جذبہ رکھتا ہو، یہ بھی کوشش رہے گی کہ بات زیادہ پیچیدہ نہ ہونے پائے مگر مفہوم کی وسعت اگر کہیں تعبیر میں لپٹ کر اسے گنجلک کردے تو بصیرت والا قاری خود اپنے حسنِ نظر سے اس کی پرتیں کھول لے گا ایسا ہماری چھٹی حس کہتی ہے، بہرحال چلیں! الٹی گنتی شروع کرتے ہیں، بہت سنجیدگی سے ملاحظہ کریں، ہم سوال نہیں دہرا رہے، سیدھے جواب لا رہے ہیں، قارئین ہر جواب سے پہلے ربط کے لیے دوبارہ سوال پر نظر ڈال سکتے ہیں۔

* چار۔۔۔ سیکولر جمہوریت یا جدید ریاست میں حکومت اخلاقیات یا ذمہ داری کے احساس سے نہیں چلتی بلکہ بس چلتی ہے اور جب تک وہ چلتی رہتی ہے تب تک کسی کو نہیں پرواہ کہ چلانے والے نے کیا کیا، کیوں کیا، کس حد تک گھٹیا کیا، اگر صبح مارکیٹ کھلے ہیں، کچہریاں انصاف ناپ تول کر دے رہی ہیں، سڑکیں اپنی ناکہ بندیوں کے ساتھ کھلی ہیں، اسکولوں میں تعلیم کا کاروبار جنسی آزادی کے ساتھ جاری ہے اور اسپتال موت و حیات کی کشمکش میں بہتر موت پر بدتر حیات کو ترجیح دے رہے ہیں، تب تک سب کچھ نارمل ہے، مغربی جمہوریت میں تو دہائیوں سے یہ بالکل معمول کی بات رہی ہے مگر اب مشرق میں بھی تقریباً وہی ماحول پیدا ہو چکا ہے یا یوں کہیں کہ مشرق اِس معاملے میں بھی مغرب سے پچاس سال پیچھے ہی رہا، بہرحال! جدید ریاست میں تعلیمی اداروں اور سیاسی حد بندیوں کے ذریعے شہریوں کی ایسی تربیت کر دی گئی ہے کہ جب تک سب معمول کے مطابق یا کچھ اونچ نیچ کے ساتھ چل رہا ہے تب تک کسی کو کوئی فکر نہیں ہے، آج کی دنیا میں جمہوری بادشاہ کی بدچلنی کو حکومت کے چلن سے جدا کر لیا گیا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ماضی قریب میں بدچلن حکومتوں کو سدھارنے کے نام پر مذہب کو حکومت سے جدا کر دیا گیا تھا، گویا چوتھے سوال کے جواب میں ہم بہت اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں! سیکولر جمہوریت کا ڈھانچہ کھڑا ہی اس طرح کیا جاتا ہے کہ بدکردار لوگوں کی پذیرائی و پشت پناہی ہو سکے. پھر چوں کہ ووٹنگ کے نام پر ایوان ایسے سینکڑوں نمائندوں سے بھرا ہوا ہے جو بدکرداری میں ایک دوسرے پر واضح سبقت لے جانے والے ہیں لہٰذا اگر کسی دن عوام کا غصہ کسی ایک بدکردار پر پھوٹ پڑے اور نوبت انقلاب اور تختہ پلٹ تک آ بھی جائے تو زیادہ حرج نہیں، اس لیے کہ ریاست عوام کی وقتی خوشی کے لیے ایک کو برطرف کرے گی اور مسکرا کر کہہ دے گی، یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی، یوں آج کی دنیا میں ہر مرتبہ جدید سیکولر ریاست ہی ایمان داری اور بدعنوانی کے دو متضاد میدان ایک ساتھ مارنے میں کامیاب رہتی ہے۔

* تین۔۔۔ کچھ لوگ بس یہ گمان کر کے مطمئن ہیں کہ یہ اخلاقی زوال ہے، کوئی عام شخص یا کوئی خاص سیاستدان

یا کوئی سائنسدان، کیا فرق پڑتا ہے جب وہ اخلاقی طور پر گر جائے تو کسے باشد، وہ کچھ بھی کرسکتا ہے. گویا یہ فائلز ایسے ہی چند سر پھروں کی داستان ہے اور بس، ہم کہتے ہیں اخلاقی تنزل یا اخلاقی جرائم کا پایا جانا کسی بھی انسانی معاشرے کا ایک حصہ ہے مگر یہاں بات صرف اخلاقی گھناؤنے پن کی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ فرد کے انفرادی نظریہ کا ہے جو کہ در حقیقت اُس معاشرتی کُل کا متفقہ عقیدہ ہے جس کا وہ محض ایک فرد ہے، ہمارے یہاں اب تک مغرب کو محض اشیاء کی ترقی کے ضمن میں دیکھا گیا ہے، عموماً لوگ تہذیبِ مغرب کی نظریاتی بنیادوں سے صَرفِ نظر کر کے صِرف مغرب کی ترقی کو سامنے رکھتے ہوئے عروج و زوال کی داستانیں ترتیب دے ڈالتے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ جب ''ترقی'' ہی کسی معاشرتی کُل کی کُل ذمہ داری ٹھہرا دی گئی ہو تو ترقی کے نام پر برہنہ گھومنے سے لے کر بے تحاشا جنسی تسکین کا سامان کرنے تک سب کچھ صرف اس لیے جائز ٹھہرتا ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہیں، ایک معاشرہ اگر ''آزادی'' اور ''ترقی'' کے ایسے نعروں پر اپنی بنیاد رکھتا ہے جہاں انفرادی لذت اور مفاد کے لیے سارے اخلاقی دائرے توڑے جاسکتے ہیں اور تمام معاشرتی یا خاندانی اقدار کو رد کیا جاسکتا ہے یہ کہہ کر کہ ایک آزاد معاشرے میں ہر فرد اپنی مرضی کا مالک ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے کی آزادی میں خلل نہ ڈالے، تو ایسے معاشرے میں چند افراد کی جانب سے اپنی آزادی کے ساتھ لذت کی انتہا تک پہنچنے کے لیے انتہائی گھناؤنا راستہ اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، اگر مغربی معاشرے کی سائنسی بنیادوں کو کھود کر تجزیہ کیا جائے تو ''نظریۂ ترقی'' کا سڑا گلا فکری مواد ہاتھ لگے گا، مغربی تہذیب کے پس منظر میں ترقی یافتہ ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی ٹیکنالوجی کی طاقت سے ایسے گھناؤنے افعال کر سکتے ہیں، پھر ان کی وجہ سے ممکنہ طور پر ہونے والی جسمانی تباہی سے بچ بھی سکتے ہیں، سیاسی پاور کے ذریعے اِن کاموں کی معاشرتی سزا بھی رکوا سکتے ہیں اور میڈیا چوں کہ ہمارے کنٹرول میں ہے لہذا میڈیا کی ستر پوشی مزید ہمیں اپنے ہمہ جہت ننگے پن کے باوجود مظلومیت کے لبادے میں ڈھانپ کر رکھ سکتی ہے، سو ہم اپنی ترقی کی اعلیٰ منزل پر خواہش کی بے تحاشا تکمیل بلا تأمل کر سکتے ہیں، گویا فائلز میں موجود اخلاقی تنزل کے یہ نمونے دراصل وہ نتائج ہیں جو کسی معاشرے میں ''نظریۂ ترقی'' کے اپنے عروج پر پہنچنے پر برآمد ہونے کا قوی امکان بلکہ غالب گمان موجود ہوتا ہے، یہ محض اخلاقی زوال نہیں ہے بلکہ نظریہ ترقی کا کھوکھلا پن ہے جو کسی بھی معاشرے کو سڑا گلا کرنا قابل زیست بنا دیتا ہے۔

* دو۔۔۔ اب یہ سوال آتا ہے کہ کیا لبرل ذہن جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کو اتنا ہی برا سمجھتا ہے؟ اس کے جواب میں سادہ سی بات یہ ہے کہ لبرل ذہن کا سوچا سمجھا رسپانس ایسے معاملات میں یہ ہوتا ہے کہ ''ایک حد تک تو ٹھیک تھا، اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا'' لبرل ذہن کو پہلے ہی آزادئ افکار و اظہار کا چسکا لگا ہوتا ہے، وہ حقوق کے روا نا روا نعروں میں ایک خاص نہج پر پروان چڑھا ہوتا ہے. لبرل سوچ کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہم اگرچہ نیک ہیں مگر برائی اختیار کرنا کسی اور کی پسند ہوسکتی ہے لہٰذا ہمیں ان کے گناہوں پر برداشت کا رویہ اپنانا چاہیے، جیسے ہمیں نیکی کرنے کی آزادی ہے ویسے ہی انہیں گناہ کرنے کی آزادی ہے اور ہمارے گرد دنیا میں ہر کوئی اپنی آزادی برت رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ لبرل اقدار پر چلنے والے معاشروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے، لبرل شخص اپنے گرد کی دنیا کو کچھ اس طرح دیکھتا ہے کہ اختلاط مرد و زن کو روکنا تنگ نظری ہے، یوں ہی اگر زنا بالرضا ہو رہا ہے تو یہ مرد عورت کی اپنی آزادی ہے، ہمیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیے بلکہ ہم جنس پرستی کا جذبہ بھی اگر کہیں زور مار رہا ہے تو یہ ان کا حق ہے کہ اپنی انفرادی آزادی کے طور پر وہ ایسا کریں، یہاں تک تو سارے لبرل متفق ہوتے ہیں، پھر کچھ ذہنی مریض جانوروں اور بچوں سے تسکین کا خبیث نعرہ لگاتے ہیں، یہاں پہنچ کر باقی لبرل معاشرہ تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ دانستہ نظریں چرا لیتا ہے اور جیسے اُن درندوں پر تنقید کرنے والوں کو ٹال نہیں پاتا ویسے ہی ان کی تحسین کرنے والے لبرل افراد کو روکتا بھی نہیں ہے، حاصل یہ کہ لبرل معاشرہ ایسے کرتوت دیکھتا تو ہے مگر اپنے اصولوں کے مطابق اس پر آواز بلند نہیں کرسکتا، گویا ہم جن افعال کو گھناؤنا سمجھ رہے ہیں اس لیے کہ ہم اب تک ایسے معاشرے میں ہیں جہاں اسلامی اقدار بہت حد تک رائج ہیں وہ افعال لبرل معاشرے یا لبرل ذہن کے لیے کسی حد تک ناپسندیدہ تو ہیں مگر گھناؤنے نہیں، شاید ان کے لیے یہ اتنا ہی برا ہو جتنا کسی مرد کا سرِ راہ لوگوں کی طرف رخ کر کے پیشاب کرنا۔

* ایک۔۔۔ نظریہ شفافیت کے باطن کُش ہونے کو ہم کسی اور تحریر میں کھولیں گے، فی الحال کے لیے اس کی اتنی معرفت کافی ہے جس سے متعلقہ موضوع کی قباحت واضح ہو جائے، نظریۂ شفافیت Transparency کا موٹا موٹی مفہوم یہ ہے کہ معلومات سیدھی اور آسان زبان میں ہونی چاہئیں، عوام کے لیے ہمہ وقت دستیاب ہونی چاہئیں، پھر وہ جیسی ہیں ویسی ہی آگے بڑھا دی جائیں بغیر کسی وضاحت یا نتیجے کے، نیز جو ادارے معلومات کو لیے ہوئے ہوتے ہیں وہ صرف انفارمیشن کو ظاہر کر دینے کے ذمہ دار ہیں، اس کے آگے کسی ایکشن کے ذمہ دار نہیں، یہ بظاہر بڑا خوبصورت نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ بھئی! جب ہم انسان ایک ساتھ ایک معاشرے میں رہتے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کو نہایت شفاف انداز میں مربوط ہونا چاہیے، کسی کے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں کسی کے پاس کچھ ایسا چھپا ہوا نہ ہو جس سے دوسروں کو دھچکا لگ سکتا ہو مگر اِس شفافیت کے نام پر سوائے اعلانِ جرائم کے اور کچھ سامنے نہیں آتا، بات یہ نہیں کہ اُن درندوں کی تنہائیاں کتنی گھناؤنی ہیں، بات یہ ہے کہ ان تنہائیوں کو ظاہر کر کے آپ کی میری ہم سب کی تنہائی میں خلل ڈالا جا رہا ہے، مسئلہ یہ نہیں کہ وہ بد باطن لوگ ہیں مسئلہ یہ ہے کہ ان کے باطن کی خباثت کو ہمارے درمیان علی الاعلان ظاہر کر کے ایسے متعارف کرایا جا رہا ہے جو ہمارے باطن کو بری طرح ڈیمج کرنے کے لیے کافی ہے، مزید یہ کہ ایسی شفافیت کے ذریعے نیکی اور بدی کو ہمسر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، گویا یہ جتلایا جاتا ہے کہ نیکی کی ترغیب اور برائی پر ترہیب کوئی چیز نہیں، بد ترین جرائم کو بھی اُسی لب و لہجے اور سادگی کے ساتھ عوام میں رکھا جائے جس میں اچھے کاموں یا چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو بیان کیا جاتا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجموعی طور پر ہم پورے معاشرے کو خیر کی ترغیب دلائیں گے یا شر سے نفرت کی طرف لے جائیں گے، بس ہم کسی صحافی کے خبر سنانے کی طرح برائیوں بلکہ شدید ترین جرائم کو سنا کر فارغ ہو جائیں گے، یہ ہے نظریہ شفافیت کا وہ پوشیدہ شر جو جرائم کو ایکسپوز کرنے کے نام پر ان کو نارملائز کوتا ہے، جدید مغرب ایسی بہت سی اصطلاحات سے بھرا پڑا ہے جن کا ظاہر خوش نما اور باطن نہ صرف یہ کہ شر آمیز ہوتا ہے بلکہ اکثر عذاب آلود بھی ہوتا ہے۔

اختتامیہ: طویل کافی طویل ہو جانے کے باوجود وعدے کے مطابق اختتام بھی جوڑ لیتے ہیں جو کہ قیمتی نکات سے خالی نہ ہوگا، اگرچہ محررہ بالا مواد اپسٹن فائلز کے کوڑے دان سے متعلق تھا مگر کوڑے دان سے اتنا سبق تو لیا جاسکتا ہے کہ فلاں فلاں چیز گندگی ہے جسے کسی صالح ماحول یا جگہ پر نہیں آنے دینا چاہیے، آجائے تو پھیلنے نہیں دینا چاہیے، یہاں ہم بغیر کسی پیچیدگی کے چار خباثتوں کا ذکر کر دیتے ہیں۔

* جدید سیکولر ریاست
* لبرل انداز فکر
* نظریہ شفافیت
* نظریہ ترقی

اس تناظر میں ہم اہل اسلام پر اپنے اسلامی معاشرے کے لیے چند اقدامات کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

۱) اپنے سیاسی شعور کو سیکولر جمہوریت کی طرف مائل ہونے سے بچانا، یعنی بوجہِ اضطرار اس کی کم ترین شکل کو اپنانے پر اکتفا کرنا، اسے کوئی مستقل نافع نظام نہ سمجھنا. کم نصیبی سے پچھلی نصف صدی میں ایسا ہو چکا ہے اور اب تدارک کی سخت ضرورت ہے۔

۲) اپنی معاشرتی فضا کو لبرل ڈھانچے پر ڈھلنے سے بچانا، یعنی یہ سمجھنا کہ جدید تعلیم کے نام پر ساری ذہنی لبرل خرافات پال لینے کے بعد ظاہری اعمال کے اسلامی ڈھنگ پر ہونے کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی ہے، لہٰذا بطور مسلمان لبرل نظریات کی بدعقیدگی سے بچنا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔

۳) بے تحاشا ترقی کے نعرے میں بہنے کی بجائے دنیا و آخرت کی فلاح کا متوازن طرز زندگی لے کر چلنا بلکہ دنیا کی فلاح اس میں سمجھنا کہ جس دنیا کے ذریعے آخرت کمالی جائے وہ دنیا اچھی ہے، باقی محض متاع اور مچھر کے پر سے بھی گئی گزری۔

۴) خارجی مادہ پرستی سے اپنے داخل کو محفوظ رکھ کر اپنی روحانیت کو زندہ رکھنا، یعنی شفافیت کے اس بہاؤ سے اپنے آپ کو باہر رکھنا جو اٹھتا تو ظاہر سے ہے مگر باطن کو بھی ساتھ بہالے جاتا ہے، شفافیت کے نام پر اپنے معاشرے میں افشائے شر کا ماحول نہ بننے پائے یہ نگرانی رکھنا ضروری ہے۔

یہ کرنا لازم ہے، ورنہ کیا فرق پڑتا ہے کسی شخص کا نام یہودی طرز کا ہو یا اسلامی طرز کا، وہ مشرقی ہو یا مغربی، بہرحال! اگر اس کے سوچنے سمجھنے کے سارے تناظر خالص لبرل سیکولر ترقی پسند ہوں تو معاشرے اور فرد کا نام تو جدا جدا ہو سکتا ہے مگر نتیجہ اُس سے کم گھناؤنا نہیں آ سکتا جتنا گھناؤنا ابھی فائلز کے انکشاف میں نظر آ رہا ہے. وقت رہتے اپنے معاشرے کی فکری بیماریوں کو پہچان کر اس کا علاج کیجیے اور اپنے گرد کے ماحول کو جہنم بننے سے، نیز اپنے قرابت داروں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچا لیجیے۔

ٹرمپ کی ڈھٹائی اور بدحواسی

Moira Donegan

امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کسی کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے۔ وہ شاید چاہتے بھی یہی ہیں کہ لوگ بس سوچتے رہ جائیں اور وہ دانہ چُگ جائیں۔ امریکا میں ہر سال کانگریس میں ایک خطاب ہوتا ہے جسے اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس کہا جاتا ہے یعنی صدرِ مملکت کو ملک کی مجموعی حالت کے بارے میں تمام اہم حقائق سامنے لانا پڑتے ہیں۔ اِس بار اسٹیٹ آف دی یونین خطاب میں صدر ٹرمپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ ٹیلی پرامپٹر پر اپنی تقریر پڑھنے میں بھی الجھن کا سامنا کرتے رہے اور اِس دوران شدید بدحواسی اور قدرے مایوسی کے عالم میں انہوں نے پوڈیم کو سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ سب کچھ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُن کے ذہن پر غیر معمولی دباؤ ہے۔ وہ بہت حد تک مایوسی کا بھی شکار ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ کا ایک غیر معمولی ٹیلنٹ یہ بھی ہے کہ ایک زمانے سے چلی آ رہی مضبوط روایات کو بھی اِس طور برتتے ہیں کہ وہ قطعی غیر متعلق محسوس ہونے لگتی ہیں۔ وہ تقریر خاصے پُرجوش اور چنگھاڑتے ہوئے انداز سے کرتے ہیں۔ وہ جب پارٹی کے متوقع امیدواروں کو جمع کرنے کی غرض سے منعقد کی جانے والی تقریب میں بھی اِس طور رطب اللسان ہوتے ہیں کہ اُن امیدواروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی مشق لاحاصل سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ جب وہ صدر کی حیثیت سے بنیادی حقائق کو پالیسی سازی سے الگ کرتے ہیں اور اِس کے بجائے سُنی سُنائی باتوں، مفروضوں اور الل ٹپ باتوں کی بنیاد پر فیصلے کرنے لگتے ہیں تب وہ قطعی ناکارہ اور غیر بارآور ''مہارت'' کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب وہ عوام میں جھوٹ بولتے ہیں اور اِس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اُن کے بے بنیاد تصورات، خیالی باتیں اور مسخ حقائق ہی حکومت کے اقدامات کی سمت کا تعین کریں گے تب وہ نیوز میڈیا کی دنیا سے وابستہ ہم جیسے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ سچ کو جمع کر کے شایع کرنے کا کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں۔

میرا خیال ہے امریکی عوام بھی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہیں کہ جنھیں انہوں نے قیادت کے لیے منتخب کیا ہے وہ آخر کر کیا رہے ہیں۔ حالیہ اسٹیٹ آف دی یونین خطاب سن کر عوام نے ضرور سوچا ہوگا کہ اب اِس خطاب کی کیا اہمیت اور وقعت رہ گئی ہے۔ آئین نے صدر کو پابند کیا ہے کہ وہ ہر ملک کی مجموعی حالت کے بارے میں کانگریس کو وقتاً فوقتاً حقائق سے آگاہ کرتا رہے۔

تاہم ذاتی نوعیت کے ٹیلی وائزڈ خطاب کی گنجائش کہاں ہے اور وہ بھی ابلاغِ عامہ کے اِس دور میں کہ جب کسی بھی بات کو عوام تک پہنچانے کے لاتعداد ذرائع موجود ہیں اور انہیں بروئے کار بھی لایا جا رہا ہے۔

صدر ٹرمپ نے دو گھنٹے تقریر کی۔ اِس میں جھوٹ بے حساب تھا اور پالیسی سے متعلق کچھ بھی ایسا نہ تھا جو عوام کے کام کا ہو۔ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس قدر طویل خطاب کیوں ضروری سمجھا گیا اور اُس میں ملک کی مجموعی حالت کے بیان سے متعلق کیا تھا۔

پورے خطاب کے دوران صدر ٹرمپ واضح طور پر تھکے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ ٹیلی پرامپٹر سے پڑھنے میں واضح دشواری محسوس کر رہے تھے۔ پوڈیم کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا گویا گرنے کا خوف تھا۔ اُن کی پوری طرزِ خطاب بدحواسی کی حدوں کو چُھو رہی تھی۔ خطاب کے آخری حصے میں تو اُن کی آواز ایسی گڑبڑا گئی کہ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں یا کیا کہنا چاہتے ہیں۔ تب اُن کی عمر صاف جھلک رہی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُن کی تقریریں لکھنے والے بھی اب تھک چکے ہیں۔

کانگریس کے ذریعے پوری قوم سے خطاب میں کچھ بھی نیا نہ تھا۔ صدر ٹرمپ نے اپنے پسندیدہ موضوعات ہی کو چُھوا۔ تارکینِ وطن کی مجرمانہ ذہنیت اور اُن کے کمتر ہونے کا رونا روئے بغیر بات کیسے بن سکتی تھی؟ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین کو بھی لتاڑنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی لازم سا تھا کہ وہ اپنی شخصی خوبیوں کے گُن گائیں۔ خطاب میں پالیسی سے متعلق نکات برائے نام تھے۔ کئی اہم معاملات پر انہوں نے واضح تضاد بیانی کا مظاہرہ کیا۔ جو کچھ خود کہا تھا اُس کے خلاف بھی کہہ گئے۔ بہت سے حقائق انہوں نے خاصے غلط انداز سے پیش کیے۔ رائے عامہ کے جائزوں میں عوام جن معاملات کو بہت اہم قرار دیتے ہیں

اُن کے بارے میں کچھ کہنے کی امریکی صدر کو سُوجھی ہی نہیں۔

خطاب کے دوران صدر ٹرمپ کئی مرتبہ رُکے اور اِس کا مقصد سابق فوجیوں کو اُن کی خدمات پر سراہنا اور انہیں تمغے دینا تھا۔ لوگوں نے اِسے میڈیا اسٹنٹ کے طور پر لیا۔ انہوں نے موسمِ سرما کے اولمپکس میں امریکی ٹیم کی آئس ہاکی میں کامیابی یعنی گولڈ میڈل جیتنے کو بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ایوانِ صدر کے مختلف حصوں میں آئس ہاکی ٹیم کے کھلاڑیوں سے تمغوں کے ساتھ پریڈ بھی کرائی۔ ایک عشرے قبل صدر ٹرمپ نے امریکی سیاست میں سیاست اور تفریحِ طبع کا مرکب پیش کرکے ایک نیا اور خاصا مقبول ٹرینڈ متعارف کرایا تھا مگر اِس بار اسٹیٹ آف دی یونین نے ثابت کردیا کہ ٹرمپ اب لوگوں کے لیے تفریحِ طبع کا سامان کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوچکے ہیں۔

ہاں، دلوں کو تکلیف پہنچانے کا فن وہ اب تک نہیں بھولے ہیں۔ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر کہا کہ وہ صحتِ عامہ کے خرچ کو معقولیت کی حدود میں لے آئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک بھر میں لوگوں کے لیے بنیادی نوعیت کا علاج بھی ڈھنگ سے کرانا بہت مہنگا ہوچکا ہے۔ انہوں نے افورڈیبل کیئر ایکٹ کے تحت دیے جانے والے زرِاعانت میں غیر معمولی کٹوتیوں کے ذریعے عوام کے لیے مزید پریشانی کا سامان کیا ہے۔ اور یہ محض دو ڈھائی ماہ پہلے ہی کی بات ہے۔ امریکی صدر نے یہ دعوٰی بھی کیا کہ وینیز ویلا کے صدر مدورو کی گرفتاری اور تیل سمیت تمام قدرتی وسائل کے حوالے سے صریح بلیک میلنگ سے دراصل اُس ملک کے لوگوں کے لیے نئے اور پُرکشش معاشی مواقع پیدا ہورہے ہیں۔

صدر ٹرمپ نے یہ دعوٰی بھی کیا کہ تارکین وطن کے خلاف کارروائیوں سے متعلق ڈیپارٹمنٹ آف ہوم لینڈ سکیورٹی کے فنڈ ڈیموکریٹ ارکان کی طرف سے روکے جانے کے نتیجے میں ملک کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ معقول حد تک فنڈز جاری نہ کروا پانے کے باعث ڈیپارٹمنٹ آف ہوم لینڈ سکیورٹی ملک کے مشرقی ساحل سے سٹے ہوئے علاقوں سے برف بھی بروقت نہ ہٹاسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اِس ادارے کا ہے ہی نہیں۔ صدر ٹرمپ نے یہ دعوٰی بھی کیا کہ ہم ایک ایسی قوم کی تعمیر کر رہے ہیں جس کا ہر بچہ بھرپور ترقی کرے گا اور بہت آگے جائے گا۔ اُن کے اِس دعوے سے وہ عقوبت خانے ذہن کے پردے پر نمایاں ہوگئے جہاں لیام کونیجو ریموز اور دوسرے بہت سے بچوں کو محض نسلی تعصب کی بنیاد پر قید رکھا گیا ہے اور اُن کی تعلیم، آزادی اور مزید بہت کچھ داؤ پر لگ چکا ہے۔

صدر ٹرمپ نے اپنے خطاب میں، حسبِ معمول، تارکین وطن کو بھی خوب لتاڑا۔ یہ اُن کا فیورٹ موضوع ہے اور ہمدردیاں بٹورنے کا آسان ذریعہ بھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ملک میں ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ تارکینِ وطن انگریزی میں لکھے ہوئے روڈ سائن پڑھ نہیں پاتے۔ صدر ٹرمپ نے یہ بھی کہا کہ جن تارکین کا کوئی دستاویزی ثبوت میسر نہیں اُن میں سے بیشتر جرائم پسند ذہنیت کے حامل ہیں اور اُن کے ہاتھوں ملک میں تشدد کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور بہت سے امریکی زخمی ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ تارکینِ وطن کے ہاتھوں بہت سی اموات بھی واقع ہوئے ہیں۔

حد یہ ہے کہ امریکی صدر نے اپنے خطاب میں صومالیہ سے تعلق رکھنے والے قانونی حیثیت کے حامل سیاہ فام باشندوں پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ انہوں نے امریکا میں رشوت کا کلچر متعارف کرایا ہے۔ یہ لوگ امریکی ریاست منیسوٹا میں سکونت پذیر ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ دنیا بھر میں کرپشن، بھتہ اور رشوت عام ہے اور اب یہ سب کچھ امریکا میں بھی پھیلایا جارہا ہے۔ اِس حوالے سے انہوں نے نسل پرستانہ ریمارکس دے کر عام امریکیوں کو اُکسانے کی کوشش کی۔ اپنے نائب جے ڈی وینس کی طرح صدر ٹرمپ نے یہ بھی کہا تھا کہ تارکینِ وطن اپنے اپنے ملک میں پایا جانے والا کرپشن کا کلچر امریکا میں منتقل کررہے ہیں، پھیلا رہے ہیں۔

یہ بات عوام کے لیے بہت حیرت انگیز ہے کیونکہ صومالیہ سے تعلق رکھنے والے تارکینِ وطن کے بارے میں تو ایسا کچھ زیادہ سُننے کو نہیں ملا مگر ہاں پورا ملک جانتا ہے کہ ٹرمپ کاروباری شخصیت ہیں اور انہوں نے سیاسی معاملات میں کاروباری دنیا کو خوب آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے کئی بڑے کاروباری اداروں سے خطیر رقوم بھی پارٹی فنڈ کے نام پر یا ایسی ہی دیگر مدوں میں وصول کی ہیں۔ اگر ٹرمپ کو امریکا میں کرپشن کلچر کا منبع تلاش کرنے کی اتنی ہی فکر ہے تو وہ آئینہ دیکھ سکتے ہیں۔

انتظامیہ کی بدنصیبی یہ ہے کہ صدر ٹرمپ ایسا جھوٹا اور مفروضوں پر مبنی مواد ہی اپنے خطاب میں پیش کرسکتے تھے اور وہ بھی اِتنے غیر موثر انداز سے۔ امریکا بھر میں صدر ٹرمپ کے لیے قبولیت گھٹ رہی ہے۔ سی این این نے رائے عامہ کے ایک حالیہ جائزے میں بتایا ہے کہ صدر ٹرمپ کو اِس وقت صرف ۳۸ فیصد امریکیوں کی حمایت حاصل ہے۔ اور ایسا اِس لیے ہے کہ ملک بھر میں معاشی مواقع گھٹتے جارہے ہیں۔ ٹرمپ نے افراطِ زر پر قابو پانے کا بھی اعلان کیا تھا مگر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ امریکی معیشت ڈانواڈول ہے۔ انہوں نے کئی ملکوں پر ٹیرف بڑھایا ہے۔ اِس کے نتیجے میں درآمدات مہنگی ہوگئی ہیں اور یوں عام امریکی کو سب کچھ مہنگا مل رہا ہے۔ ٹیرف کے معاملے میں امریکی سپریم کورٹ بھی حال ہی میں ٹرمپ کے اقدامات کے خلاف رولنگ دے چکی ہے مگر اِس کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ وہ ٹیرف سے متعلق پالیسی تبدیل کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیں گے۔ اِس پورے معاملے میں جو کچھ بھی غلط ہو رہا ہے اُس کی قیمت عام امریکی صارفین کو ادا کرنا پڑے گی۔

صدر ٹرمپ اور اُن کے ساتھی یہ دعوٰی کرتے نہیں تھکتے کہ امریکا میں اسٹاک مارکیٹ اوپر جارہی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مصنوعی ذہانت کے ہاتھوں پوری معیشت داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ ہزاروں امریکیوں کی نوکریاں کسی بھی وقت جاسکتی ہیں۔ بڑے کاروباری ادارے بڑے پیمانے پر چھانٹی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ٹیکنالوجیز کی ناکامی کی صورت میں اچھی خاصی سرمایہ کاری بھی بے موت مر جائے گی اور اگر ٹیکنالوجیز کامیاب ہوگئیں تو عام امریکیوں کی قوتِ خرید میں غیر معمولی کمی واقع ہوگی۔ دونوں ہی صورتوں میں امریکی محنت کشوں کے لیے مسائل بڑھیں گے۔ خطاب کے دوران صدر ٹرمپ بار بار کہتے رہے کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

صدر ٹرمپ نے اپنے خطاب میں ڈیموکریٹس کو لتاڑنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ انہوں نے سیاسی مخالفین کو پاگل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی وجہ سے ملک تباہی کی راہ پر گامزن ہے۔

اِن تمام باتوں پر ری پبلکن ارکان نے کھڑے ہوکر خوب تالیاں بجائیں جبکہ ڈیموکریٹ ارکان بیٹھے رہے اور خاصے تحمل سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے وہاں بیٹھ کر یہ سب کچھ کیوں برداشت کیا۔ وہ ایوان میں موجود ہی کیوں تھے؟ ڈیموکریٹ ارکان نے پورے تحمل سے خطاب سُنا اور کسی بھی مرحلے پر احتجاج نہیں کیا۔ صدر ٹرمپ نے اِس بات سے بھی یہ ثابت کردیا کہ اب رسمی نوعیت کی تہذیب بھی باقی نہیں بچی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Trump has lost the ability to entertain.
Sadly, he hasn't lost the ability to offend".
("The Guardian". February 25, 2026)

امریکی امریکا چھوڑ رہے ہیں!

Drew Hinshaw-Joe Parkinson

ریاست ہائے متحدہ امریکا اپنے ۲۵۰ویں سال میں ہے۔ جو امریکا کبھی تارکینِ وطن کی سرزمین ہوا کرتا تھا وہ اب ملک چھوڑنے والوں کی سرزمین میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔

گزشتہ برس امریکا نے وہ دیکھا جو اُس نے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے دی گریٹ ڈپریشن (عظیم کساد بازاری) کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ امریکا آنے والوں سے زیادہ تعداد امریکا سے نکلنے والوں کی رہی۔ ٹرمپ انتظامیہ نے امریکا سے نکلنے کے اِس رجحان کو سراہا ہے جو غیر قانونی تارکینِ وطن کو نکال باہر کرنے سے متعلق اُس کے انتخابی وعدے کی تکمیل کی ایک شکل ہے۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران کُھل کر کہا تھا کہ وہ غیر قانونی تارکینِ وطن کو کسی بھی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ اُنہوں نے اِس حوالے سے نئے اور سخت تر قوانین نافذ کرنے کا اعلان بھی کیا تھا۔ غیر قانونی تارکینِ وطن کے خلاف کریک ڈاؤن بھی کیا گیا ہے۔ جو کچھ اُنہوں نے کہا تھا اُس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ لوگوں کو امریکا آنے سے روک دیا جائے گا مگر اِس کے بجائے یہ ہو رہا ہے کہ امریکی شہری اپنی فیملی کے ساتھ ایسے ملکوں کا رُخ کر رہے ہیں جہاں وہ ڈھنگ سے رہ سکیں، معیاری زندگی بسر کرنے کے متحمل ہوسکیں۔

آئزن ہاور انتظامیہ کے بعد سے اب تک امریکا نے وطن چھوڑنے والے امریکیوں سے متعلق جامع اعداد و شمار جمع کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی ہے۔ رہائش کے اجازت ناموں، بیرونِ ملک مکانوں کی خریداری، طلبہ کی انرولمنٹ اور دیگر معاملات کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی شہری پچاس سے زائد ملکوں میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ اپنی آمدنی کی حدود میں پُرسکون زندگی بسر کرسکیں۔ اِس وقت کم و بیش دس لاکھ امریکی بیرونِ ملک پڑھ رہے ہیں، ٹیلی کمیوٹنگ کر رہے ہیں اور ریٹائرمنٹ کی مدت بھی باہر ہی گزار رہے ہیں۔ امریکا کے بہت سے شہریوں کے لیے اب امریکی خواب یہ ہے کہ امریکا میں نہ رہا جائے۔ ایک زمانے سے امریکا کے لیے کشش اور وہاں آباد ہوکر روشن مستقبل تلاش کرنے کو امریکی خواب کہا جاتا رہا ہے۔

پرتگال کے دارالحکومت لزبن کے گرینڈ کینال ڈاک نامی علاقے میں امریکیوں کی تعداد اِتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ وہاں اب پرتگالی کے بجائے انگریزی سنائی دینے لگی ہے۔ اِس علاقے کے ہر پندرہ میں سے ایک شخص امریکا میں پیدا ہوا ہے۔ ریئل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی میں آئرلینڈ میں سکونت پذیر امریکیوں کی تعداد سے یہ تناسب زیادہ ہے۔ تب پوٹیٹو فیمین نامی قحط سے گھبرا کر امریکیوں نے نقلِ مکانی کی تھی۔ بالی، کولمبیا اور تھائی لینڈ میں امریکا کے ریموٹ ورکرز کی رہائش اور اُنہیں ڈالر میں ادائیگی اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ مقامی باشندے احتجاج پر مجبور ہیں۔

امریکا کے ایک لاکھ سے زائد نوجوان کم خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرونِ ملک جامعات میں رجسٹرڈ ہیں۔ امریکا اور میکسیکو کی سرحد کے نزدیک واقع میکسیکن نرسنگ ہومز میں امریکا کے معمر افراد کی تعداد بڑھ جارہی ہے جو کم خرچ میں بہتر ہیلتھ کیئر پانا چاہتے ہیں۔ امریکا میں علاج بھی مہنگا ہے اور علاج کے بعد کی دیکھ بھال بھی۔

میکسیکو میں قائم Expatsi نامی ادارہ امریکیوں کو بیرونِ ملک سکونت پذیر ہونے میں معاونت اور راہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ ۴۰۰ سے زائد امریکیوں نے البانیا میں آباد ہونے کے حوالے سے راہ نمائی اور معاونت کے لیے رجسٹریشن کرائی ہے۔ مشرقی یورپ کے اِس ملک نے امریکی شہریوں کو خصوصی ویزا پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت دی ہے اور ایک سال تک آمدنی پر کوئی ٹیکس وصول نہ کرنے کی سہولت بھی دی جائے۔ مزید یہ کہ مستقل آباد ہونے والے امریکیوں سے کچھ پوچھا بھی نہ جائے گا۔

امریکیوں کو بیرونِ ملک آباد ہونے میں مدد دینے والے اِس ادارے کی سربراہ ۵۴ سالہ جین بارنیٹ البانیا میں پیدا ہوئی تھیں اور انہوں نے ۲۰۲۴ء میں ترکِ وطن کرکے میکسیکو کے شہر یوکاٹن میں رہائش اختیار کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک زمانہ تھا کہ امریکا کے کھاتے پیتے گھرانوں کے افراد مہم جوئی اور کچھ نیا دیکھنے کی خاطر دنیا بھر میں گھومتے پھرتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب عام امریکی اپنے معاشی اور معاشرتی حالات سے تنگ آکر امریکا چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ ایکسپیٹری نے ۲۰۲۴ء میں امریکیوں کے تین گروہوں کے بیرونِ ملک دوروں کا اہتمام کیا تھا۔ رواں سال اِن گروہوں یا جتھوں کی تعداد ۵۷ ہوگی۔ جین بارنیٹ کہتی ہیں کہ ہمارا ہدف دس لاکھ امریکیوں کو بیرونِ ملک آباد کرنا ہے۔

چند سیاسی تجزیہ کاروں نے امریکی باشندوں کے اِس ترکِ وطن کو ڈونلڈ ڈیش کا نام دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکیوں نے اپنے وطن سے نکلنا اچانک شروع کردیا ہے۔ یہ رجحان کئی سال سے پنپ رہا تھا اور لوگ تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے تو ریموٹ ورک یعنی گھر بیٹھے بیرونِ ملک کام کرنے کا رجحان توانا ہوا۔ امریکا میں رہائش کا مہنگا ہوتے جانا بھی ایک اہم عامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی اپنی طرزِ رہائش میں تبدیلی کے بھی خواہش مند ہیں۔ وہ یورپ کے بہت سے ممالک کی طرزِ رہائش سے متاثر ہیں اور قدرے اطمینان بخش معاشرتی حالات چاہتے ہیں۔

امریکی ایوانِ صدر کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ کم و بیش تمام ہی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں امریکی معیشت بہتر کام کر رہی ہے، ٹرمپ انتظامیہ لاکھوں غیر قانونی تارکینِ وطن کو ڈی پورٹ کر رہی ہے جبکہ دوسری طرف بہت سے غیر ملکی باشندے امریکا میں مستقل رہائش اور کام کرنے کی سہولت پانے کے لیے دس لاکھ ڈالر دے کر گولڈ کارڈ حاصل کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

گزشتہ برس امریکا سے ترکِ وطن کرنے والوں کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ لاکھ تھی۔ رواں سال اِس تعداد میں مزید اضافہ متوقع ہے۔ یہ بات پبلک پالیسی تھنک ٹینک بروکنگز انسٹیٹیوشن نے بتائی ہے۔ ادارے کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار تھوڑے کم یا زیادہ بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ امریکی اداروں کو اس قسم کے اعداد و شمار کی درستی کی زیادہ فکر لاحق نہیں ہوتی۔ ۲۰۲۳ء میں امریکا آنے والوں کی تعداد ۶۰ لاکھ تھی جو ۲۰۲۵ء میں ۲۶ تا ۲۷ لاکھ رہ گئی۔ اِس دوران امریکا سے کم و بیش ۶ لاکھ ۷۵ ہزار افراد کو نکالا گیا جبکہ ۲۲ لاکھ غیر ملکی نے رضاکارانہ طور پر امریکا چھوڑنا بہتر جانا۔ یہ اعداد و شمار ڈپارٹمنٹ آف ہوم لینڈ سیکیورٹی کے فراہم کردہ ہیں۔

معروف امریکی اخبار 'وال اسٹریٹ جرنل' نے ۱۵ ملکوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ جزوی اعداد و شمار کے مطابق ایک لاکھ ۸۰ ہزار امریکیوں نے وہاں کا رُخ کیا ہے۔

اِس وقت کم و بیش ۴۰ لاکھ تا ۹۰ لاکھ امریکی بیرونِ ملک

آباد ہیں۔ اِس حوالے سے جامع ترین اور درست ترین اعداد و شمار کا حصول کم و بیش ناممکن ہے۔ محکمہ خارجہ نے بتایا ہے کہ ۲۰۲۲ء میں میکسیکو میں سکونت پذیر امریکیوں کی تعداد ۱۶ لاکھ تھی۔ کووِڈ کی وبا کے بعد سے یہ تعداد مستقل بڑھتی رہی ہے۔ میکسیکو میں جرائم پیشہ گروہوں کی آپس کی خوں ریز لڑائی نے امریکیوں کے وہاں آباد ہونے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ کینیڈا میں اِس وقت ڈھائی لاکھ سے زائد امریکی آباد ہیں۔ اِن میں دہری شہریت والے بھی بڑی تعداد میں ہیں جو کام کے سلسلے میں روزانہ کینیڈا جاتے اور واپس آتے ہیں۔ پیرس میں قائم ادارے دی ایسوسی ایشن آف امریکن ریزیڈنٹس اوورسیز نے بتایا ہے کہ یورپ میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد امریکی آباد ہیں جن میں سے کم و بیش سوا تین لاکھ برطانیہ میں ہیں۔

یہ اعداد و شمار جامع نہیں کیونکہ اِن میں امریکیوں کے ہاں بیرونِ ملک پیدا ہونے والے بچوں کو شمار نہیں کیا گیا۔ طویل مدتی ویزا پر قیام کرنے والے طلبہ بھی شامل نہیں۔ بہت سے لوگ ۹۰ دن کے ویزا پر آتے ہیں اور پھر مزید تین ماہ کا ویزا لینے کے لیے واپس جاتے ہیں۔ بہرکیف، یورپ میں آباد ہونے والے امریکیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جو بہت حیرت انگیز رجحان ہے۔ یورپی یونین کے تمام یعنی ۲۷ ارکان میں رہنے اور کام کرنے کے لیے آنے والے امریکیوں کی تعداد اِس وقت ریکارڈ سطح پر ہے اور اِس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کووِڈ کی وبا سے اب تک پرتگال میں آباد ہونے والے امریکیوں کی تعداد میں ۵۰۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ برس کا اضافہ ۳۶ فیصد رہا ہے۔ دس سال کے دوران اسپین اور ہالینڈ میں سکونت اختیار کرنے والے امریکیوں کی تعداد میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہی معاملہ چیک جمہوریہ کا بھی ہے۔

گزشتہ برس امریکا آنے والے جرم باشندوں کے مقابلے میں جرمنی کا رخ کرنے والے امریکیوں کی تعداد زیادہ رہی۔ یہی معاملہ آئرلینڈ کا بھی رہا جس نے دس ہزار امریکی باشندوں کا خیر مقدم کیا۔ یہ تعداد ۲۰۲۴ء میں آئرلینڈ پہنچنے والے امریکیوں کی تعداد سے دُگنی تھی۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کووِڈ کی وبا کے دوران ورک فراہم ہوم یا بیرونِ ملک آن لائن کام کرنے کے رجحان کا عکس ہے تو ایسا نہیں ہے۔ اعداد و شمار کچھ اور بتاتے ہیں۔ امریکی حکومت کو اپنے بہت سے باشندوں کی طرف سے شہریت ترک کرنے کی درخواستوں کا سامنا ہے۔ اس حوالے سے بیک لاگ بہت زیادہ ہے یعنی درخواستیں پروسیسنگ میں پھنسی ہوئی ہیں۔ بہت سے امریکی بیرونِ ملک ہونے والی اپنی آمدنی پر ٹیکس دینے سے بچنے کے لیے کسی اور ملک کا پاسپورٹ حاصل کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ امیگریشن فرمز نے بتایا ہے کہ ۲۰۲۴ء میں ایسی درخواستوں کی تعداد میں ۴۸ فیصد تک اضافہ ہوا۔

۲۰۲۴ء کے بعد سے اب تک برطانوی شہریت کے حصول کے لیے درخواست دینے والے امریکیوں کی تعداد اِس وقت ریکارڈ سطح پر ہے۔ مارچ ۲۰۲۵ء تک ایسے امریکیوں کی تعداد ۶ ہزار تھی۔ ۲۰۲۴ء میں ۳۱,۸۲۵ امریکیوں نے آئرلینڈ کا پاسپورٹ حاصل کیا جبکہ گزشتہ برس یہ تعداد ۴۰ ہزار رہی۔

دی یو ایس سیسنس بیورو نے میکسیکن حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا ہے کہ گزشتہ برس امریکا میں پیدا ہونے والے کم و بیش ۵۰ ہزار میکسیکن امریکیوں نے گزشتہ برس کام کاج کے سلسلے میں سرحد پار کی۔

امریکیوں کو بیرونِ ملک آباد ہونے میں مدد فراہم کرنے والی کمپنیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ فرم فرماؤں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے لیے LuxNomads نامی ادارہ کام کر رہا ہے۔ صدر ٹرمپ کے ناقدین کو بیرونِ ملک آباد ہونے میں مدد فراہم کرنے کے لیے Tours GTFO میدان میں ہے۔ سیاہ فام امریکیوں کی مدد کے لیے Blaxit Gloabl کی خدمات حاضر ہیں اور امریکی خواتین کی خصوصی طور پر مدد کرنے کے لیے SheHitRefresh نامی ادارہ میدان میں اترا ہوا ہے۔ گزشتہ برس کے ایک گیلپ سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ ۱۵ سے ۴۴ سال تک کی ۴۰ فیصد امریکی خواتین مستقل طور پر بیرونِ ملک سکونت پذیر ہونے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ اِس کے مقابلے میں ۲۰۲۳ء میں افریقا کے صحرائے صحارا کے زیریں ممالک سے امریکا منتقل ہونے کے خواہش مند افراد کا تناسب ۳۷ فیصد رہا۔

امریکیوں کو بیرونِ ملک آباد ہونے میں مدد دینے والے اداروں کا کہنا ہے کہ مہم جوئی کے شوق میں یا پھر اپنے ریٹائر ہونے والے والدین کے ساتھ بیرونِ ملک مستقل قیام کے خواہش مند افراد کے ساتھ ساتھ اب اچھے خاصے سیٹلڈ امریکی بھی ملک چھوڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ ان میں ماہرینِ تعمیرات، مالیاتی مشیر، انجینیر سبھی شامل ہیں۔ امریکا میں معیاری زندگی بسر کرنے کی لاگت بہت بڑھ گئی ہے۔ کھانے پینے کی اشیا بہت مہنگی ہیں، رہائش کے لیے بہت خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر صحتِ عامہ کا معاملہ بھی تشویش ناک ہو چلا ہے۔ امریکی ریاستوں میں اِس حوالے سے قوانین کا بہت فرق پایا جاتا ہے۔ بہت سے امریکی کم لاگت میں معیاری زندگی بسر کرنے کے لیے اندرونِ ملک بھی شفٹنگ کے عذاب سے دوچار ہیں۔ شادی کی ناکامی سے دوچار ادھیڑ عمر افراد نئی زندگی شروع کرنے میں اور معذوری کے باعث سماجی بہبود کے نام پر ملنے والے وظیفے کے حوالے سے مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

ری لوکیٹنگ کمپنیوں نے بتایا کہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں امریکی باشندے بیرونِ ملک منتقلی کے وقت بیوی اور اولاد کو بھی ساتھ رکھنے میں دلچسپی لے رہے ہیں تاکہ وہاں بچوں کے لیے بہتر تعلیم ممکن بنا سکیں۔

ڈیلاس (امریکا) کی ایک انویسٹمنٹ فرم کے لیے کام کرنے والے اور برلن (جرمنی) میں بچوں کے لیے بیس بال لیگ چلانے والے ۴۱ سالہ کرس فورڈ کا کہنا ہے کہ بیشتر امریکی والدین کو یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ اُن کے بچے کہیں اسکولز میں ہونے والے فائرنگ کے واقعات میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں یا پھر اُن میں بھی تشدد پسندی نہ در آئے۔ کرس فورڈ کہتے ہیں کہ امریکا میں تنخواہ تو زیادہ ہے مگر معیارِ زندگی بہت پست ہے۔ یورپ میں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔

ایک طویل مدت تک دنیا بھر کے لوگوں کے لیے خود کو منزل قرار دینے والے ملک کو اِتنی بڑی تعداد میں اپنے باشندوں کے ترکِ وطن کے نتیجے میں بہت سے بنیادی سوالوں کا سامنا ہے۔ کیا اِسے امریکی معیشت کی کامیابی کی علامت قرار دیا جائے؟ آخرکار امریکا کی بلند اجرتیں ہی تو طلبہ کو بیرونِ ملک پڑھنے اور بوڑھوں کو بیرونِ ملک نئی زندگی شروع کرنے میں معاونت فراہم کر رہی ہیں۔ سلیکون ویلی ہائی ٹیک کی بدولت عالمی معیشت پر چھائی ہوئی ہے اور اِس کا فائدہ تمام ہی امریکیوں کو پہنچ رہا ہے۔

کیا یہ سمجھا جائے کہ امریکا کے اپنے باشندوں کو اب اپنے ملک کے مستقبل اور طرزِ زندگی پر یقین اور بھروسا نہیں رہا؟ امریکا سے ترکِ وطن کرنے والے امریکی باشندوں کا کہنا ہے کہ معاشی معاملات الجھے ہوئے ہیں، طرزِ زندگی کی

گراوٹ بھی مسائل پیدا کر رہی ہے اور امریکی حکومت جو کچھ کر رہی ہے اُس کے نتیجے میں بے یقینی بڑھ رہی ہے۔ جرائم کا گراف بلند ہو رہا ہے۔ ڈپریشن کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ ہر معاملے میں مہنگائی کے بڑھنے کی رفتار بہت زیادہ ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کا ایک بار پھر اقتدار میں آنا بھی امریکیوں کو اپنے ہی ملک سے بددل کرنے کا ایک بڑا سبب ہے۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ۲۰۰۸ء کی کساد بازاری کے دوران گیلپ سروے میں پتا چلا تھا کہ صرف ۱۰ر فیصد امریکی وطن چھوڑنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اب یہ تعداد ۵۰ فیصد ہے۔ امریکی حکومت دعوٰی کرتی رہی ہے کہ وہ سب سے الگ، بلند اور بہتر ہے مگر اب اِس بھرم کے غبارے سے بھی ہوا نکل چکی ہے۔ امریکیوں میں اپنے وطن کے لیے پائی جانے والی بددلی اور دیگر معاشرتی رجحانات پر نظر رکھنے والے ٹیمپل یونیورسٹی کے دو محققین میں سے ایک کیٹن جوئس کہتی ہیں کہ اب امریکیوں کو اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ بیرونِ ملک منتقل ہو کر اپنے وطن کے ماحول سے کہیں اچھے ماحول میں خود کو سمو سکتے ہیں اور معیارِ زندگی برقرار رکھنے کی لاگت بھی معقول ہے۔ اُنہیں یورپ کی سوشل ڈیموکریٹک پالیسیوں میں بہت زیادہ کشش محسوس ہو رہی ہے۔

مردم شماری کے محکمے کے اعداد و شمار کے مطابق موجودہ رجحان سے قبل امریکا سے جانے والوں کے مقابلے میں یہاں آنے والوں کی تعداد کے کم ہونے کا واقعہ ۱۹۳۵ء میں رونما ہوا تھا۔ تب امریکی سوویت یونین میں آباد ہونے کو ترجیح دے رہے تھے۔ تب ایک لاکھ سے زائد امریکیوں نے اشتراکی ریاست میں ٹریکٹر پلانٹس، اسٹیل ملز اور دیگر فیکٹریوں میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ سوویت یونین نے امریکیوں کا استقبال کیا۔ اِن میں سے بہت سے ماسکو کے گورکی پارک میں بیس بال کھیلتے رہے اور دوسرے بہت سے امریکیوں کو عقوبتی مراکز میں بھی رکھا گیا۔ ۱۹۳۸ء تک اِتنی بڑی تعداد میں غیر ہنرمند امریکی سوویت یونین کا رخ کرنے لگے کہ وہاں کی حکومت نے امریکا سے آنے والوں سے واپسی کے سفر کا ثبوت مانگنا شروع کر دیا۔

کسی زمانے میں جو کچھ سوویت یونین نے کیا تھا وہی اب یورپ کی سوشل ڈیموکریسیز کر رہی ہیں۔ امریکیوں کو مختلف طریقوں سے لبھایا جا رہا ہے۔ یورپی ریاستیں اُن کے لیے ویزا کے قواعد نرم کر رہی ہیں، ٹیکس میں رعایت کا اعلان کر رہی ہیں۔ اپنے ملک میں غیر معمولی ٹیکسوں کا سامنا کرنے والے امریکیوں کو یہ سب بہت پُرکشش محسوس ہو رہی ہے اور یوں اُن کا ترکِ وطن پر مائل ہونا فطری امر ہے۔

تحقیقی ادارے لگزمبرگ انکم اسٹڈی نے بتایا کہ یورپ کو امریکیوں کی ضرورت ہے۔ امریکیوں کی اجرت بہت زیادہ ہے۔ اُن میں صلاحیت کی بھی کمی نہیں اور لاکھوں امریکی بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے تڑپ بھی رہے ہیں۔ دوسری طرف یورپ کے بیشتر ممالک کو کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اور اُن کی آمدنی کی بھی۔ یورپ کا پنشن سسٹم شدید مشکلات کا شکار ہے۔ سبکدوش ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فرانس کا یہ حال ہے کہ عام معمر باشندہ محنت کش نوجوانوں سے کہیں زیادہ پنشن کی مد میں وصول کرتا ہے۔ بلند شرح والے ٹیکس اور کمتر شرحِ نمو کے باعث یورپ میں عمومی طور پر اجرتیں بہت کم ہیں۔ یورپ کے ریٹیلرز، ریسٹورنٹس اور ریئل اسٹیٹ ایجنٹس کو غیر ملکی کرم فرماؤں کی اشد ضرورت ہے۔

یورپی ریاستیں صحتِ عامہ کے شعبے میں کمتر لاگت کی سہولتیں پیش کر رہی ہیں۔ امریکیوں کے لیے رہنا آسان بنایا جا رہا ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی نہیں رہا۔ امریکی وہاں قیام کے دوران اپنی زبان میں بات کر سکتے ہیں کیونکہ یورپی باشندے بھی اب اپنی زبان میں بات کرنے پر بضد نہیں ہیں۔ یورپی شہروں میں رہائش کم قیمت ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھپانے کی گنجائش بھی ہے۔ تعلیمی فیس بہت کم ہے۔ یورپ کی جامعات کا معیار امریکی جامعات سے بلند ہے۔

یہ بات بہت حیرت انگیز ہے کہ امریکی باشندے یورپ کا رخ کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ امریکی صدر کی پالیسیوں نے یورپ کو بہت حد تک ناراض کیا ہے۔ بیشتر معاملات میں یورپ اپنی راہ پر گامزن ہے اور ٹرمپ انتظامیہ کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ امریکی صدر کے انتہائی مالدار حامی امریکا اور یورپ کے تعلقات میں دراریں پیدا کر رہے ہیں۔ امریکا میں بہت سے رجعت پسند یہ کہتے ہیں کہ یورپ کی معیشت ساکت و جامد ہے کیونکہ ٹیکسوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے اس لیے اُس کے مالدار ترین افراد خطے کو چھوڑ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ گزشتہ برس یورپ کے ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ملینیئرز نے نقلِ مکانی کی ہے۔ اِن میں سے ۷۵۰۰ کو امریکا اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ یہ اعداد و شمار ری لوکیٹنگ فرم ہینلے اینڈ پارٹنرز نے فراہم کیے ہیں۔ امریکا کے ہائی ٹیک اور مالیات کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی بڑی تعداد میں یورپ کا رخ کر رہے ہیں۔ یہ جنوبی یورپ میں رہنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔

امریکی ریاست ٹیکساس سے تعلق رکھنے والے ایک فن ٹیک اسپیشلسٹ نے اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اُس نے اپنی امریکی پبلک ہیلتھ پالیسی منسوخ کر کے ایک یورپی کمپنی کا ہیلتھ انشورنس لے لیا ہے۔ اِس کے نتیجے میں اُسے مالیاتی طور پر اِتنی راحت ملی ہے کہ اب اُس کا بیٹا میڈرڈ کے ایک بڑے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ اِس کی رہائش ایک ایسے علاقے میں ہے جسے مقامی باشندے امریکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر پلازا ایو ایس اے کہنے لگے ہیں۔

ہسپانوی حکومت کی ترجمان ایلما سینز ڈیلگاڈو کہتی ہیں کہ بہت سے امریکی یہاں آتے ہیں اور اُن کی پریم کہانیاں مشہور ہو رہی ہیں۔ ایلما سینز ڈیلگاڈو کا آبائی قصبہ پیمپلونا ہے جو بل فائٹنگ کے لیے مشہور ہے۔ امریکی بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ بل رننگ فیسٹیول کو معروف مصنف ارنسٹ ہیمنگوے نے بھی قلم بند کیا ہے۔

امریکی صدر نے اپنی ریلیوں میں ناروے کے باشندوں کو امریکا آنے کی تحریک دینے کی بات کئی بار کہی ہے مگر ایک عشرے کے دوران امریکا آنے والے ناروجین باشندوں کی تعداد میں مستقل کمی واقع ہوتی رہی ہے۔ ۲۰۲۴ء میں ایک اہم سنگِ میل عبور کیا گیا۔ اب امریکا کی پیدائش والے افراد کی ناروے میں تعداد ناروے کی پیدائش والے افراد کی امریکا میں تعداد کے مقابلے میں کم ہے۔

اور ایسا نہیں ہے کہ صرف وہی امریکی ترکِ وطن کر رہے ہیں جو معیارِ زندگی برقرار رکھنے کی بڑھتی ہوئی لاگت سے پریشان ہیں۔ ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ گزشتہ برس یورو کے مقابلے میں امریکی ڈالر کی قدر میں ۱۲ر فیصد سے زیادہ کی کمی واقع ہوئی۔ اِس کے نتیجے میں یوروزون کے متعدد ممالک کا رخ کرنے والے امریکیوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ فرانس، اٹلی، اسپین اور جرمنی کے ساتھ ساتھ سلووینیا اور پرتگال جیسے چھوٹے ممالک میں آباد ہونے کی خواہش رکھنے والے امریکیوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔

ایڈوب اور پیراماؤنٹ جیسے بڑے اداروں کے لیے کام کرنے والا ۵۶ سالہ امریکی کریئٹیو پروڈیوسر مائیکل لی بلانک اب پرتگال کے دارالحکومت لزبن سے فری لانسنگ کر رہا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ پرتگال میں رہنے کے حوالے سے اُسے صرف زبان کی الجھن کا سامنا ہے۔ وہ زبان سیکھ تو رہا

ہے تاہم یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔

مائیکل لی بلانک نے لاس اینجلس کے ایک اسکول میں، جہاں اُس کا بیٹا پڑھتا تھا، اندھا دھند فائرنگ کے دوسرے سانحے کے بعد اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پرتگال منتقل ہونے کو ترجیح دی۔ اُس کی بیوی ۴۲ سالہ اسٹیفنی امریکا میں اکیڈمک ایڈوائزر رہوا کرتی تھی۔ اُس نے پرتگال منتقل ہونے والے امریکیوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے اور املاک فروخت کرنے والے ایجنٹ کی حیثیت سے کام تلاش کرلیا ہے۔ پرتگال میں مکانات اور دیگر املاک خریدنے والے غیر ملکیوں میں ۵۸ فیصد امریکی ہیں۔ پرتگال کے دارالحکومت اور دیگر شہروں میں بہت سے علاقوں کے مکانات کی قیمتیں پانچ سال میں دُگنی ہوگئی ہیں۔

پرتگال اور اسپین کے پرائم ٹائم شوز میں سیاست دان اب اِس نکتے پر بحث میں مصروف ہیں کہ غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر مقامی باشندوں کی حق تلفی روکنے کے حوالے سے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ ہسپانوی شہر بارسلونا میں مقامی باشندے غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پریشان ہیں۔ وہ ریموٹ ورکرز کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ دیوار پر ڈیجیٹل نومیڈز واپس جاؤ جیسے نعرے لکھنے کی ابتدا ہوچکی ہے۔

بارسلونا کی ایک بلند و بالا عمارت میں لیا ماشا کے امریکیوں کو اِس شہر میں منتقل ہونے میں معاونت کرنے والی فرم چلا رہی ہے۔ وہ ویزا کے حصول سے ڈاکٹرز کی سہولتیں فراہم کرنے تک سارے ہی کام کر رہی ہے۔ لیا ماشا کے کہتی ہے کہ بیشتر امریکی یہ کہتے ہیں آتے ہیں کہ اُن کا قیام صرف ایک سال کے لیے مگر اس نے اب تک کسی بھی کلائنٹ کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

لیا ماشا کے کے شوہر ایکیڈ نے ۲۰۲۴ء میں بارسلونا ہائی اسکول کھولا (جو امریکی اسکول ہے) اور یہ سوچا کہ اِس کے ذریعے وہ اپنے بیٹے کو امریکا منتقل کرنے میں کامیاب رہے گا۔ اُس کے بیٹے نے میڈرڈ کی آئی ای یونیورسٹی میں داخلہ لینا زیادہ مناسب سمجھا جس میں اب اُتنے امریکی طلبہ ہیں جتنے ہسپانوی ہیں۔ اِسی اسکول میں امریکی طلبہ کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور وہ وہیں ہاسٹل میں سکونت بھی اختیار کر رہے ہیں۔ گزشتہ برس وہاں سکونت پذیر امریکی طلبہ ۳۰۰ تھے، اب ۶۰۰ ہوچکے ہیں۔ اسکول کی ڈائریکٹر ایمینڈ اسلیفو کا کہنا ہے کہ نیو یارک اسٹیٹ اور کیلی فورنیا سے بہت سی امریکی خاندان منتقل ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ الاسکا، اوٹاہ، ٹیکساس، کولوراڈو اور کینٹکی سے بھی خاندان آرہے ہیں۔

سوشل میڈیا پر جو کچھ نمودار ہو رہا ہے اُس نے بھی امریکیوں کو ترکِ وطن کی تحریک دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بہت سے انفلوئنسرز بھی اِس حوالے سے مصروفِ کار ہیں۔ سابق پروفیشنل ڈانسر کیسی روز نے اٹلی میں نئی زندگی شروع کی ہے۔ اُس نے اپنے تجربے، مشاہدے اور یادوں پر مشتمل کتاب ''یوڈیز روگڈ جیلیٹو'' انسٹاگرام پر شیئر کی ہے۔ اُس کے فالوئرز کی تعداد ۳۰ لاکھ سے زائد ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ امریکا کے سیاہ فام باشندوں کے لیے کینیا اور دوسرے بہت سے ملکوں میں انتہائی پُرکشش مواقع موجود ہیں۔

امریکا میں مقیم صاحبانِ علم میں جو لوگ بیرونِ ملک ملازمت تلاش کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں اُن کی تعداد میں ایک سال کے دوران کم و بیش ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہ بات عالمگیر سطح کا تعلیمی ڈیٹا فراہم کرنے والے برطانوی ادارے ٹائمز ہائر ایجوکیشن نے بتائی ہے۔ امریکا کے جو اکیڈمکس بیرونِ ملک کریئر اور پرسکون زندگی تلاش کر رہے ہیں اُن کی غالب اکثریت یورپ کا رخ کر رہی ہے۔ یورپی یونین نے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے پروفیشنلز کو اپنے ہاں آنے کی تحریک دینے کے لیے ۵۰۰ یوروز کی فنڈنگ رکھی ہے۔ بیرونِ ملک پڑھانے والے امریکی پروفیسرز اور محققین نے امریکا میں دائیں بازو کے عناصر کو اِس صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیا ہے کیونکہ تعلیمی تحقیق کے لیے فنڈنگ میں کٹوتی کردی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بائیں بازو کے لوگوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ وہ جامعات میں طلبہ پر کچھ زیادہ ہی نظر رکھ رہے ہیں۔

امریکا آنے والے غیر ملکی طلبہ کی تعداد میں گزشتہ برس ۱۷ فیصد کمی واقع ہوئی اور آنے والے برسوں میں مزید کمی کا امکان ہے۔ یورپی جامعات سے ڈگری پانے کی خواہش رکھنے والے امریکیوں کی تعداد میں ۲۰۱۱ء سے اب تک ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوچکا ہے۔ گزشتہ برس یہ اضافہ ۱۴ فیصد رہا۔ یہ بات برطانوی جامعات میں داخلوں سے متعلق ادارے یو سی اے ایس نے بتائی ہے۔ برطانوی شہزادے ولیم کی مادرِ علمی اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹی آف سینٹ اینڈریوز میں امریکی طلبہ کی تعداد اِتنی بڑھ چکی ہے کہ اب اُسے منی نیٹکیٹ کی عرفیت دی گئی ہے۔ وال اسٹریٹ جرنل نے اسپین، اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ میں پڑھنے والے ۱۲ امریکی طلبہ سے بات کی تو اُن میں سے صرف ایک نے امریکا واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سانتا مونیکا سے تعلق رکھنے والے سینڈٹ اینڈریو یونیورسٹی کے طالب علم بروڈی ولکز کا کہنا ہے کہ اگر لندن کے کسی ریسٹورنٹ میں بھی کام کرنا پڑے تو کچھ ہرج نہیں کیونکہ ویک اینڈ پر اوسلو، برلن یا کوپن ہیگن جانے کا آپشن تو ہوگا۔ میں امریکا میں کسی کارپوریٹ جاب پر ایسی جاب کو ترجیح دوں گا کیونکہ مہنگی رہائش کا دردِ سر نہ ہوگا اور دوسرے بہت سے جھنجھٹ بھی نہ ہوں گے۔

امریکی ریاست نیو یارک کے قصبے بفیلو سے تعلق رکھنے والی کیلی میکوئے سالانہ ۸۰ ہزار ڈالر کی تنخواہ سے گزارا کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ انشورنس اینالسٹ تھی۔ ۲۰۲۴ء میں وہ البانیا منتقل ہوئی۔ اب وہ رومانیہ میں ہے۔ البانیا میں قیام کے دوران ایک بار اُس کا ہاتھ ٹوٹا تو وہ اسپتال پہنچی۔ وہاں صحتِ عامہ کی سہولتیں مفت ہیں۔ معیار بھی بہت بلند ہے۔ یہ سب کچھ کیلی میکوئے کے لیے بہت حیرت انگیز تھا۔

۴۵ سالہ کیلی اب رومانیہ میں وارد ہونے والے امریکیوں کے لیے مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہی ہے۔ بہت سے امریکی رومانیہ پہنچ کر سوشل سکیورٹی کے تحت دی جانے والی رقوم کی مدد سے جی رہے ہیں۔ امریکا میں اُن کے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔ کیلی کہتی ہے کہ البانیا میں محض ایک ہزار ڈالر ماہانہ پر بھی ڈھنگ سے گزارا ممکن ہے۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Americans are leaving the U.S. in record numbers." ("wsj.com". Feb25, 2026)

حج و عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کے لیے اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی راہنما کتاب

ندائے ابراہیمؑ

تالیف و ترتیب: حبیب الرحمٰن (جدہ)

قیمت: ۱۵۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

یورپ کے دفاع کا ذمّہ کس کا؟

J.D. Bindenagel and Stephan Richter

سوال صرف یہ نہیں ہے کہ یوکرین پر لشکر کشی کرکے روس نے یورپ کے لیے مسائل کھڑے کیے۔ یورپ ایک طویل مدت سے ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ عالمی سیاست میں جو بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اُنہیں سمجھنے سے یورپ بہت حد تک قاصر رہا ہے۔ پورے براعظم میں مختلف سطحوں پر شدید تذبذب پایا جاتا ہے۔ یہ فطری ہے یا نہیں اِس بحث سے قطعِ نظر حقیقت یہ ہے کہ یورپ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ بہت حد تک بے ذہنی کی بھی علامت ہے اور حقیقت سے نظر چُرانے کا مظہر بھی۔ یورپی قوتیں اِس بات کو سمجھنے سے بہت حد تک قاصر رہی ہیں کہ اب اُن کے لیے کسی اور خطے پر پوری طرح حکمراں ہونا انتہائی ناممکن ہے۔ دنیا بدل چکی ہے۔ ایک طرف تو یورپی قوتوں میں قوت کی کمی ہے اور دوسری طرف اُن میں مہم جوئی بھی باقی نہیں رہی۔ وہ عسکری سطح پر کچھ زیادہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اُنہوں نے نرم قوت کی راہ اپنا رکھی ہے۔ ایسے میں اُن کے لیے کچھ زیادہ گنجائش پیدا نہیں ہوسکتی۔

امریکا اِس وقت شُتر بے مہار کے مانند کہیں بھی، کچھ بھی کرتا پھر رہا ہے۔ ایک طرف امریکا بہت سی خرابیاں پیدا کر رہا ہے اور دوسری طرف یورپی قوتیں اُس کے بارے میں کچھ کہنے اور کوئی واضح موقف اختیار کرنے سے قاصر دکھائی دیتی ہیں۔ وینیز وئیلا، ایران اور غزہ کے بارے میں بھی یورپ ہچکچاہٹ ہی کا شکار رہا ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک بار پھر گرین لینڈ پر قبضہ کرنے کی بات کہی ہے تو اب لازم ہو چکا ہے کہ یورپ جاگے اور کچھ ایسا کرے جس سے امریکی حکومت کو احساس ہو کہ کسی بھی ملک یا خطے پر قبضہ کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔

یورپ کا دفاع یوکرین کر رہا ہے!

یہ بات تمام یورپی قائدین اور عوام کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب تک ڈونلڈ ٹرمپ صدر کے منصب پر ہیں تب تک امریکا کسی بھی طور یورپ کے دفاع کے لیے آگے نہیں بڑھے گا اور یہ کہ یہ نیک کام یوکرین ہی کو کرنا پڑے گا۔ اب تک اِس معاملے کو جتنا سمجھا گیا ہے بات اُس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ یورپ کو اگر روس یا کسی اور مہم جو طاقت سے نپٹنا ہے تو اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو مار کھاتا رہے گا۔

یوکرین نے چار سال تک یورپ کو روس سے بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ دراصل اپنے آپ کو بچانے میں مصروف ہے۔ یورپ کا موثر دفاع تو خود بخود ہو رہا ہے۔ مگر کب تک؟ روسی صدر ولادیمیر پوٹن مشرقی یورپ سے نکل کر مین لینڈ یورپ تک جانا چاہتے ہیں۔ وہ جرمنی کے قلب میں پہنچ کر فتح کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں۔ اِس وقت یورپ میں روس کا راستہ روکنے کی صلاحیت صرف دو افواج میں ہے۔ یوکرین اور پولینڈ۔ جرمن فوج اِس وقت شدید کمزوری کی حالت میں ہے۔ جدید ترین ہتھیاروں کی بھی کمی ہے اور افرادی قوت کی بھی اور سب سے بڑھ کر لڑنے کے جذبے کی۔

جرمن سیاست میں تفریق

اِس وقت جرمن سیاست میں فکری انتشار بہت زیادہ ہے۔ اہم قومی اور علاقائی مسائل کے بارے میں مکمل اتفاقِ رائے دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ جرمنی میں بائیں بازو کی بیشتر جماعتیں شدید مخمصے کا شکار ہیں۔ وہ زمینی حقیقتوں کے حقیقی ادراک سے ابھی بہت دور ہیں۔ بعض معاملات میں صرف ہٹ دھرمی سے کام چلایا جا رہا ہے۔ مخلوط حکومتیں بنتی ہیں جو خاصی کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ دنیا بہت بدل چکی ہے مگر جرمنی میں بائیں بازو کے عناصر اِس حوالے سے کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں۔

جرمن حکومت کے لیے لازم ہو چکا ہے کہ عسکری قوت میں غیر معمولی اضافہ یقینی بنائے اور فوری طور پر یقینی بنائے۔ جرمن فوج میں افرادی قوت کی کمی بھی ہے اور فنڈز بھی معقول حد تک نہیں ہیں۔ نیا میکینزم لانا ہے۔ جرمنی میں اب تک پوٹن کے روس سے تصفیہ کرنے اور ہم آہنگ ہونے کی سوچ پائی جاتی ہے۔ روسی صدر پوٹن فی الحال صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ملک کو زیادہ سے زیادہ ملکوں تک رسائی حاصل ہو۔ اِس کے لیے وہ مشرقی یورپ کی حدود سے کہیں آگے بڑھ کر مین لینڈ یورپ تک پہنچنے کے فراق میں ہیں۔ اِس حوالے سے اُن کی نظر جرمنی پر ہے۔ اور اگر جرمنی میں چند ہم خیال مل جائیں تو کیا کہنے۔ جرمنی کو بیرونی جارحیت سے کماحقہ نپٹنے کی صلاحیت و سکت میں بھی اضافہ کرنا ہے اور شہری دفاع کے معاملات کو بھی بہتر بنانا ہے۔ جرمنی میں بائیں بازو کے لوگ اِس طرف متوجہ ہونے کے لیے تیار نہیں۔

صرف فلاحی ریاست کا دفاع

یورپ بھر میں غیر معمولی دفاعی تیاریوں کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے مگر جرمن سوشل ڈیموکریٹس ملک کو زیادہ سے زیادہ فلاحی ریاست میں تبدیل کرنے سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے لیے تیار ہی دکھائی نہیں دیتے۔ یورپ بھر میں روسی ارادوں کے حوالے سے شدید خوف پایا جاتا ہے مگر جرمن سیاست دانوں کی اکثریت اِس طرف دھیان نہیں دے رہی۔

جرمنی میں سیاسی انتشار بڑھ رہا ہے۔ نئی پارٹیوں کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔ اِس وقت ملک کو مختلف معاملات میں ہم آہنگی اور اتفاقِ رائے کی ضرورت ہے مگر اِس کے بجائے زیادہ سے زیادہ سیاسی اختلافِ رائے ابھر رہا ہے۔ دفاع اور سلامتی کے امور پر جس قدر توجہ دی جانی چاہیے نہیں دی جا رہی۔ ساتھ ہی ساتھ خارجہ پالیسی کے میدان میں بھی وہ سب کچھ نہیں کیا جا رہا جو کیا جانا چاہیے۔

پوٹن کو منہ دینے کا سوال

روسی صدر کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ مشرقی یورپ سے آگے بڑھ کر مین لینڈ یورپ تک توسیع کے خواہش مند ہیں۔ روس کسی دور میں سپر پاور تھا۔ یہ ڈیڑھ دو صدی پہلے کی بات ہے۔ پھر سوویت یونین کی شکل میں بھی روس سپر پاور رہا۔ اُس کا سب سے بڑا مسئلہ گرم پانیوں تک رسائی کا ہے۔ اب روسی صدر اپنے ملک کی سپر پاور کی حیثیت سے عظمت کو بحال کرنے کے مشن پر نکلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عالمی امور میں روس کی آواز بھی سُنی جائے، اُس کے مشورے بھی مانے جائیں اور عالمگیر حکمرانی میں اُس کا بھی بڑا حصہ ہونا چاہیے۔ دوسرے کسی خطے کے مقابلے میں پوٹن یورپ کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ایک خطرناک بات یہ ہے کہ ولادیمیر پوٹن کی نظر میں ہر وہ علاقہ، خطہ یا ملک روس ہی ہے جہاں روسی باشندے رہتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں بھی روسی باشندے رہتے ہوں وہاں قدم جمانے کو وہ روس کا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اِس وقت روس معاشی اعتبار سے کوئی بڑی قوت نہیں اور جس طور اُس نے یوکرین میں شہروں اور قصبوں پر جی بھر کے بمباری کی ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مہذب بھی نہیں رہا۔ دوسری طرف یورپ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اِس وقت غیر معمولی کمزوری سے دوچار ہے۔

پریشانی ختم نہیں ہو رہی

یورپ کے بہت سے قائدین اور اعلیٰ عہدیدار (جن میں جرمن وزیرِ دفاع بھی شامل ہیں) آئے دن یہ کہتے رہتے ہیں کہ اِس وقت یورپ کے دفاع کے لیے غیر معمولی سطح پر منظّم ہونے کی ضرورت ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ پورے یورپ کو ۲۰۲۹ تک طے کر لینا چاہیے کہ روس سے اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ رکھنے کے لیے کیا کرنا ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور معاملات ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔

یوکرین کی صورتِ حال نے معاملات کو پورے یورپ کے لیے بگاڑ دیا ہے۔ بیشتر یورپی اقوام یہ سمجھتی ہیں کہ دفاعی تیاریوں کے لیے ۲۰۲۹ کی ڈیڈ لائن بہت زیادہ پریشان کن نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ امریکا میں کوئی ایسی حکومت قائم ہو جو یورپ کی طرف زیادہ گرم جوشی کے ساتھ دوستی اور اشتراکِ عمل کا ہاتھ بڑھائے۔

امریکا نے ایک طویل مدت تک اپنے صنعتی ڈھانچے اور معیشت کو جنگ اور عسکری تیاریوں سے جوڑ رکھا ہے۔ امریکا دنیا بھر میں جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے اور اِس کے لیے اُسے زیادہ ہتھیاروں، گولا بارود اور جنگی ساز و سامان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ امریکی اداروں ہی میں تیار ہوتا ہے اور یوں ہزاروں خاندانوں کو روزگار بھی ملتا ہے۔ امریکی پالیسیاں چونکہ بدلتی نہیں اِس لیے ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس بھی تبدیل نہیں ہوتا یعنی عسکری مہم جُوئی کے لیے ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس وقت یورپ بہت حد تک پوٹن کے رحم و کرم پر جی رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت ایک بڑی مصیبت کی طرح یورپ پر نازل ہو سکتے ہیں۔ ٹرمپ کے دور میں امریکا کس طور یورپ کے دفاع کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے یہ بات واضح نہیں۔ یورپی قائدین کو ٹرمپ پر زیادہ بھروسا نہیں۔ اِس تناظر میں امریکا کے ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امریکا دنیا بھر میں امن عام کرنے کے نام پر جنگیں مسلط کرتا آیا ہے۔ جنگ اور امن کا مفہوم وہ ہے جو امریکا طے کرے۔ اِس وقت امریکا ڈونلڈ ٹرمپ کے ہاتھوں میں ہے اور ایسے میں یورپ کو کسی حد تک اس بات کا خدشہ لاحق ہے کہ کہیں ایسی حالت پیدا نہ ہو کہ اُسے امریکا سے بہت زیادہ ہتھیار خریدنا پڑیں۔ یورپ یہ بات بھی بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ امریکا سے اِس وقت کسی بھی معاملے میں کوئی ضمانت حاصل نہیں کرسکتا۔

ضمانت کے نام پر دھوکا

معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کے چندارکان کو اب بھی امید ہے کہ یوکرین کے حوالے سے روسی صدر پوٹن ہر ضمانت اور معاہدے کے مطابق کام کریں گے۔ خیر، کوئی بھی امید کسی بھی حال میں اسٹریٹجی نہیں ہوتی۔ بڈاپسٹ میمورینڈم اور مِنسک ایگریمنٹ کا ریکارڈ شاہد ہے کہ امریکی صدر ہر معاہدے کو توڑ دیں گے۔ اگر یوکرین اور یورپی ممالک اب بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ سلامتی سے متعلق ضمانتیں روس کی مزید جارحیت کو روکنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ ڈونلڈ ٹرمپ اور اسٹیو وِٹکوف سلامتی کی ضمانتوں سے کھیل رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور اُس کے ہم خیال ممالک اب بھی روس سے رابطوں میں ہیں اور تجارتی معاہدوں کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ جارحیت روکنے کے معاہدے تو محض آڑ ہیں۔ ٹرمپ جس طرز کی سیاست کر رہے ہیں اور جو کچھ کرتے پھر رہے ہیں اُس کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ وہ روس سے جُڑے ہوئے اپنے مفادات کو داؤ پر لگانے سے گریز کی راہ پر گامزن ہیں۔

اِس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ صدر ٹرمپ نے کسی بھی مرحلے پر ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا کہ وہ روس سے کسی بھی نوع کے تصادم کو مول لینے کو ترجیح دیں گے۔ لشکر کی سطح پر تصادم تو بہت دور کا معاملہ ہے، حق یہ ہے کہ ٹرمپ تجارت اور سرمایہ کاری کے معاملے میں بھی کوئی ایسی ویسی صورتِ حال پیدا نہیں کرنا چاہتے جس کے نتیجے میں اُن کے یعنی امریکا کے مفادات کو کچھ نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

ایک بڑی الجھن یہ ہے کہ امریکا نے یوکرین سے کہا ہے کہ اگر وہ اپنے دفاع کے معاملے میں اشتراکِ عمل چاہتا ہے تو معاہدہ ہوسکتا ہے مگر اُس کے لیے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ امریکا اُسی وقت آگے بڑھے گا جب اُسے یہ اندازہ ہوگا کہ یوکرین پر کیا جانے والا حملہ واقعی اہم ہے اور تادیر جاری رہ سکتا ہے۔

یورپ کے لیے اثرات

اِس وقت اپنے دفاع کے لیے اپنے ہی زورِ بازو پر بھروسا کرنے پر مجبور ہے کیونکہ امریکا نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ یورپ میں اختلافِ نظر بہت زیادہ ہے۔ زبانوں، نسلوں اور ثقافتوں کا بھی تنوع ہے۔ ایسے میں کسی ایک نکتے پر اتفاقِ رائے آسان نہیں۔ یوکرین کو ابھی تک یورپ کی طرف سے اتفاقِ رائے کی صورت میں کسی بھی طرح کی بھرپور مدد نہیں مل سکی ہے۔ اُس نے روسی فوج کے خصوصی آپریشنز کا سامنا اپنے ہی بل پر کیا ہے۔

نیٹو کو مضبوط ہونے کے لیے وقت بھی درکار تھا اور آڑ بھی۔ یہ سب کچھ یوکرین نے فراہم کر دیا ہے۔ یوکرین کی فوج چار سال سے روسی فوج کے سامنے دیوار بنی ہوئی ہے یعنی اُسے یورپ میں آگے نہیں بڑھنے دے رہی۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ کی سلامتی کا مدار امریکا کی طرف سے ملنے والی عسکری مدد پر نہیں بلکہ یوکرین کی عسکری صلاحیتوں پر ہے۔

یورپ کو روس کی طرف سے دُہری نوعیت کے مزید حملوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگر وہ روسی فوج کے خلاف معقول نوعیت کی ردِ جارحیت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو یوکرین کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنا ہوگا۔ یوکرین کو یورپ کی طرف سے مزید ہتھیار اور گولا بارود ملنا ہی چاہیے۔ یوکرین کی فضائیہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے دور مار میزائل بھی فراہم کیے جانے چاہئیں۔ (مترجم: ابوصباحت)

"Who really defends Europe — Ukraine or the U.S.?" ("The Globalist". January 11, 2026)

بقیہ: ایک مسجد کی کہانی

گزشتہ پچیس برس سے اِس مسجد میں ہر سال اسلامک کلچر کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے۔ اکتوبر میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں گرینیڈا، سیوِل، میڈرڈ اور دیگر ہسپانوی شہروں سے مسلم اسکالرز آکر یہاں لیکچرز دیتے ہیں اور سیمنار منعقد کرتے ہیں۔ کئی ثقافتی تقریبات بھی منعقد ہوتی ہیں۔ نویں صدی عیسوی کی ایک خوبصورت عمارت کو سلامت رکھنے میں اپنا کردار ادا کرنے پر قصبے کے لوگ غیر معمولی فخر محسوس کرتے ہیں۔ ماریا کہتی ہے کہ یہ عمارت اتنی حسین ہے کہ باہر سے اِس کی مجموعی خوبصورتی کا کچھ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اور ہم جیسے ہی اِس میں داخل ہوتے ہیں یہ ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Spain's 1,000-year-old mosque reflects Andalusia's Islamic heritage". ("dailysabah.com". March 6, 2026)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950